مُرقّعِ ادب

(اُردو اختیاری)

بارھویں جماعت کے لیے

پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب کیریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ محفوظ ہیں۔
ریویو کردہ: نیشنل ریویو کمیٹی، وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب) حکومت پاکستان اسلام آباد۔
اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپر،
گائیڈ بکس، خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مؤلفین ☆ ڈاکٹر محمد خان اشرف
☆ پروفیسر سمعیہ جلیل صدیقی
☆ پروفیسر اشتیاق احمد
☆ پروفیسر ایاز اصغر شاھین

مدیر ☆ ڈاکٹر علی محمد خاں
☆ مس مہر النساء خانم

نگران ☆ ملک جمیل الرحمٰن (سینئر ماہرِ مضمون اُردو)

آرٹسٹ ☆ عائشہ وحید

ناشر: عطیہ پبلشنگ ہاؤس لاہور
مطبع: الرحیم آرٹ پریس، لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2018ء	اول	ششم	6,000	66.00

فہرست

☆☆......حصہ نثر......☆☆

نمبر شمار	سبق	مصنف	صفحہ نمبر
1	رحمۃ للعالمینؐ	قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	2
2	مولانا حالی	مولوی عبدالحق	7
3	ایک وصیت کی تعمیل	فرحت اللہ بیگ	14
4	احسن مارہروی	رشید احمد صدیقی	21
5	نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات	مولانا محمد حسین آزاد	27
6	سقراط	مہدی افادی	32
7	مسلمانوں کا عسکری اخلاق	نیاز فتح پوری	36
8	الفاظ کی کہانی	ڈاکٹر سید عبداللہ	41
9	جھینگر کا جنازہ	خواجہ حسن نظامی	45
10	بے ترتیبی	وزیر آغا	48
11	مجھے قتل کرو	فکر تونسوی	53
12	کافی	مشتاق احمد یوسفی	61
13	سفر نصیب	مختار مسعود	69
14	مکاتیب اقبالؒ	علامہ محمد اقبالؒ	74
15	مکتوبِ سید سلیمان ندوی	سید سلیمان ندوی	78
16	میاں محمد بخشؒ کا کلام	ڈاکٹر انعام الحق جاوید (مترجم)	80
17	رحمان باباؒ کا کلام	رضا ہمدانی (مترجم)	83

☆☆......حصہ نظم......☆☆

نمبر شمار	نظم	شاعر	صفحہ نمبر
1	حمد	مولانا ظفر علی خاں	85
2	نعت	محسن کاکوروی	88
3	مثنوی	میر حسن	92
4	مثنوی	دیا شنکر نسیم	96

☆☆......حصہ غزل......☆☆

نمبر شمار	شاعر	صفحہ نمبر	نمبر شمار	شاعر	صفحہ نمبر
1	ولی دکنی	102	8	مرزا اسد اللہ خاں غالب	126
2	خواجہ میر درد	105	9	مومن خاں مومن	130
3	میر تقی میر	108	10	علامہ اقبالؒ	134
4	غلام ہمدانی مصحفی	112	11	حسرت موہانی	137
5	خواجہ حیدر علی آتش	115	12	اصغر گونڈوی	140
6	بہادر شاہ ظفر	119	13	جگر مراد آبادی	144
7	محمد ابراہیم ذوق	122	14	ناصر کاظمی	148

سوانح/ شخصیت اور سیرت نگاری

سوانح نگاری کا فن اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے جہاں ایک طرف فنِ تاریخ سے منسلک ہے تو دوسری طرف فنِ ادب سے بھی۔ تاریخ کو عظیم شخصیتوں کی سوانح کے سلسلے کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اگر یہ شخصیتیں ادب سے یا ادیبوں سے متعلق ہوں یا ان کی سوانح نگاری میں فنی اور ادبی تقاضوں اور معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہو تو یہ ادب کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔

کامیاب سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے کہ سوانح نگار جہاں اپنے موضوع سے پوری طرح آگاہ ہو اور اس سے قریبی وابستگی بلکہ فنی ہمدردی رکھتا ہو وہاں اس کے پورے عہد کا مکمل شعور بھی رکھتا ہو۔ کوئی شخصیت کتنی ہی قدآور اور عام سماجی سطح سے کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، پورے فکری اور تہذیبی ماحول کی پروردہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی معاشرت، تہذیب، فکری وتمدنی پس منظر سے آگاہی، سوانح نگار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

اپنے موضوع اور اس کے عہد سے گہری واقفیت کے علاوہ سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصنف کے عہد کے حوالے سے بھی معنویت کی حامل ہو اور اس کے علاوہ وسیع تر انسانی تاریخ کے نقطۂ نظر سے بھی اس کی اہمیت ہو۔ یہ خصوصیت سوانح نگاری کی وسیع تر دلچسپی کا باعث بنتی ہے اور ایک اعلیٰ ادبی فن پارے کی طرح اپنے عہد سے بلند ہو کر ہر عہد کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اچھی سوانح، موضوع کی صرف خوبیوں اور کارناموں ہی کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کو بھی ہمدردی اور انسانی دل چسپی اور فنی بصیرت کے نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس طرح سوانح جہاں مکمل شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے، وہاں وہ نقطۂ نظر کے توازن اور اظہار کے باعث اپنے اندر سچائی، اعتماد اور یقین کی خصوصیت بھی رکھتی ہے۔ ان تمام خصوصیات کے اظہار کے لیے مناسب، پرکشش زبان اور سادہ لیکن دلکش اسلوب کا استعمال سوانح میں ادبی شان پیدا کر دیتا ہے۔ موضوع کی ترتیب و پیش کش، سوانح کی مجموعی ہیئت ترکیبی اور زبان و اظہار کا استعمال سوانح کو ادبی مرتبہ عطا کرتا ہے اور اُسے فنِ ادب کا حصہ بنا دیتا ہے۔

اردو زبان و ادب کا سوانح نگاری سے قریبی تعلق رہا ہے۔ شبلی کی ''الفاروق''، ''المامون''، ''سوانح مولانا روم'' اردو ادب کی ایسی سوانح عمریاں ہیں جنھوں نے اردو نثر کے فروغ اور مسلمانوں کو ان کی تاریخ اور گزشتہ عظمت سے روشناس کرانے میں خاصا کردار ادا کیا۔ حالی نے ''حیاتِ جاوید'' لکھ کر جہاں سرسید احمد خاں کی زندگی کی تفصیلات کو محفوظ کر دیا، وہیں اردو ادب میں سوانح کے فن کو بھی ایک واضح شکل عطا کی۔

سوانح نگاری کی ایک صورت کا نام ''شخصیت نگاری'' ہے۔ اسے ''خاکہ نگاری'' بھی کہا جاتا ہے۔ ''خاکہ نگاری'' سے مراد کسی شخصیت کا ایک ایسا تعارفی مرقع ہے جس میں اس شخصیت کے نمایاں اور اہم پہلو پڑھنے والے کے سامنے آجائیں۔ خاکہ نگار اپنی تحریر میں کسی فرد کی خوبیوں اور خامیوں، شکل و شباہت اور عادات وخصائل کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی صورت وسیرت کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ موضوع سے دل چسپی وہمدردی، شخصیت سے گہری واقفیت اور دل چسپ ودل کش پیرایۂ بیان، خاکہ نگاری کے ضروری اجزا ہیں۔ کامیاب خاکہ نگاری کے لیے ضروری ہے کہ زیرِ بحث شخصیت کی خوبیوں کے علاوہ اس کی خامیوں، کمزوریوں اور مخصوص عادات کو بھی پیش کیا جائے۔ اپنے اختصار، تاثر، دل چسپی، جامعیت اور دل چسپ وپرکشش اسلوب بیان کے باعث، خاکہ نگاری نے اردو ادب میں خاص اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں مختلف شعرا کی شخصیتوں کے بیان کی صورت میں ملتے ہیں لیکن اس کی نمایاں اور واضح مثالیں مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر''، رشید احمد صدیقی کی ''گنج ہائے گراں مایہ'' اور چراغ حسن حسرت کی ''مردم دیدہ'' ہیں۔ نئے دَور کے خاکہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو کے ''گنجے فرشتے''، محمد طفیل کے ''آپ، جناب، صاحب'' اور قرۃ العین کی ''پکچر گیلری'' اہمیت رکھتے ہیں۔

رسول اکرم صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کی سوانح مبارک لکھنے کا فن ''سیرت نگاری'' کہلاتا ہے۔ اردو ادب میں سیرت نگاری، تاریخی اور ادبی حوالوں کے علاوہ قومی اور مذہبی نقطۂ نظر سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ مولانا شبلی کی ''سیرۃ النبیؐ'' اردو ادب میں نہایت ہی اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمینؐ'' اور چودھری افضل حق کی ''محبوبِ خدا'' بھی اپنے اسلوب کی دل کشی اور رسول اکرم صلّی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کی ذاتِ مبارکہ سے محبت کے باعث اردو ادب میں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

ولادت: ۱۸۶۷ء **وفات: ۱۹۳۰ء**

علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری صوبہ پنجاب (ہندوستان) کے ایک تاریخی قصبے منصور پور میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے منصور پوری کہلائے۔ آپ کے آباو اجداد سلاطینِ مغلیہ کے زمانے میں دہلی کے قاضی تھے، اس لیے خاندانی نام قاضی پڑ گیا۔

قاضی صاحب کے والدین نے آپ کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ آپ نے عربی اور قرآن مجید کی تعلیم اپنے والد بزرگوار قاضی احمد شاہ صاحب سے حاصل کی۔ عربی میں کامل دسترس کے لیے اس دور کے جید عالمِ دین مولانا عبدالعزیز کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا۔ فارسی مہندر کالج پٹیالہ کے منشی سکھن لال سے پڑھی اور یونیورسٹی بھر میں اوّل آئے۔ سترہ سال کی عمر میں محکمہ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ بعدازاں پولیس اور عدلیہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

قاضی صاحب بے حد متواضع، خلیق اور انتہائی منکسر المزاج شخصیت تھے۔ ذہانت اور فطانت خداداد تھی۔ علما، فقرا اور آئمہ کرام کی بے حد عزت کرتے تھے۔ حضور اکرمؐ، علمائے حق اور صوفیائے عظام کے ساتھ غیر متزلزل عشق تھا۔ مسلم اکابرین کے علاوہ وہ غیر مسلم نابغہ روزگار شخصیات مثلاً شیکسپیئر اور کارلائل کا ذکر بھی بہت احترام سے کرتے تھے۔

قاضی صاحب نے ''رحمۃ اللعالمینؐ '' لکھتے وقت تحقیق کے تمام اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ انھوں نے دوسرے ادیان کا عمیق تقابلی وتنقیدی مطالعہ کیا ہے اور اس سے ان اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا جامع جواب مہیا کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہیں، جو اسلام اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم پر کی جاتی ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی شخصیت کی عظمت کو صرف ایک عقیدت مند مسلمان کی نظر ہی سے بیان نہیں کیا بلکہ توریت، انجیل اور دوسری مذہبی کتب سے بڑی عرق ریزی کے بعد دلائل تلاش کیے ہیں اور دلائل سے ثابت کیا کہ حضورؐ تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت ہیں۔ قاضی صاحب کا انداز بیان اگرچہ استدلالی ضرور ہے مگر خشک اور غیر دل چسپ ہرگز نہیں۔ انھوں نے اس وسیع موضوع کو انتہائی عمدہ طریقے سے سمیٹا ہے۔

قاضی صاحب اس کتاب کی وجہ سے بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ''تفسیر''، ''تاریخ''، ''اسماء الحسنٰی''، ''تقابلِ ادیان'' اور ''سفر نامہ حجاز'' بھی ایک کلاسیکل مقام رکھتی ہیں۔

حج بیت اللّٰہ سے واپسی پر آپ کا وصال عرشہ جہاز پر ہوا۔ آپ کی نماز جنازہ سید محمد اسماعیل غزنوی نے پڑھائی اور شرع کے مطابق آپ کے جسدِ خاکی کو سپردِ آب کر دیا گیا۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری

رحمۃ للعالمینؐ

عَزِیْز" عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (۹:۱۲۸) تمھاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے۔

یعنی تمھاری تکلیف سے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کو ضرور تکلیف ہوتی ہے۔ تمھارے درد کو وہ درد سمجھتے ہیں۔ واضح ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کی یہ صفت کفار اور مومنین دونوں کے حق میں تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم جب کفار کو کفر و شرک میں دیکھتے اور خیال فرمایا کرتے کہ یہ لوگ کس انجامِ بد کا شکار ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ کیوں کر اپنے ہاتھوں اپنے لیے چاہِ ہلاکت کھود رہے ہیں۔ تب حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کے دلِ رحم پرور کو نہایت صدمہ گزرتا تھا۔

بسا اوقات یہ کیفیت اس قدر بڑھ جاتی کہ اللہ تعالے کو حضورؐ کے تسلیہ وسکینہ کے لیے اپنا کلام و پیغام بھیجنا پڑتا۔

سورۃ یٰسین میں ہے "ان کی باتوں سے آپ اپنا جی برا نہ کریں۔"

واقعاتِ بدر میں مذکور ہے کہ جب حملہ آورانِ مکہ قید کر لیے گئے تو رات کو نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کو نیند نہ آئی، اِدھر سے اُدھر حضورؐ کروٹیں لیتے تھے۔ کرب و اضطراب نمایاں تھا۔ ایک انصاری نے عرض کی کہ حضورؐ کو کچھ تکلیف ہے، فرمایا نہیں۔ مگر عباس کے کراہنے کی آواز میرے کان میں آ رہی ہے، اس لیے مجھے چین نہیں پڑتا۔ انصاری چپکے سے اٹھا، اُس نے جا کر عباس کی مشک بندی کھول دی، اُنھیں آرام مل گیا، تو وہ فوراً سو گئے۔ انصاری پھر حاضرِ خدمت ہوگیا۔ حضورؐ نے پوچھا کہ اب عباس کی آواز کیوں نہیں آتی۔ انصاری بولا کہ میں نے ان کے بندھن کھول دیے ہیں، فرمایا جاؤ، سب قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرو۔ جب حضورؐ کو اطلاع دی گئی کہ سب قیدی اب آرام سے ہیں، تب نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کا اضطراب دور ہوا، اور حضورؐ خوابِ شیریں سے استراحت گزیں ہوئے۔

ذرا سوچنا ہے، قیدی وہ تھے جنھوں نے ۱۳ سال تک متواتر اہل ایمان کو ستایا تھا، کسی کو آگ پر لٹایا، کسی کو خون میں نہلایا، کسی کو بھاری پتھروں کے نیچے دبایا، کسی کو سخت اذیتوں کے بعد خاک و خون میں سلایا تھا اور پھر ان پر یہ نرمی، یہ سلوک۔

عباس حضورؐ کے چچا تھے اور جہاں تک معتبر روایات سے معلوم ہوا ہے، وہ با دل ناخواستہ صرف قوم کے اکراہ و اجبار سے بدر میں آئے تھے۔ بااین ہمہ حضورؐ کے عدل و انصاف نے ان میں اور دوسرے قیدیوں میں کوئی امتیازی فرق قائم کرنا پسند نہ فرمایا۔

لیکن حضورؐ کی رحم دلی اور طبعی شفقت و رافت کا یہ عالم تھا کہ جب تک سب قیدیوں کے بہ آرام ہونے کی رپورٹ نہ لی، اس وقت تک حضورؐ کو نیند تک نہ آئی۔

جب نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم ہجرت فرما کر رونق افروز مدینہ ہو چکے تو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر قحط شدید کی آفت کو اُتارا، قحط اس شدت کا تھا کہ اہل مکہ کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہوگئی۔

ابوسفیان اموی ہمیشہ مسلمانوں سے برسرِ پرخاش رہا کرتا تھا، وہ خود دربارِ مصطفویؐ میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے عرض گستر

ہوا کہ حضورؐ ہمیشہ احسان اور صلہ رحم کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ ہم حضورؐ کے قرابتی ہیں اور رحم کے ملتجی۔ احسان فرمائیے اور دعا کیجیے کہ اس قحطِ شدید سے ہم کو نجات ملے۔

نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ثمامہ بن اُثال سردار نجد کو جو دولتِ ایمانی سے مالا مال ہو چکا تھا، حکم بھیج دیا کہ مکہ میں فوراً غلّہ پہنچانے کا بندوبست کرے۔ اُس کے علاقہ میں اناج بہ کثرت تھا۔ اُس نے غلّہ صرف اس لیے روک رکھا تھا اور منفعتِ تجارت کو بھی نظرانداز کر دیا تھا کہ اہل مکہ دشمنانِ رسولؐ ہیں۔ اب حکم نبویؐ کی تعمیل ہوئی اور اہل مکہ کی جان میں جان آئی۔

یہ بھی دشمنوں کے مقابلہ میں عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ کا ایک ثبوت تھا۔

جنگِ طائف ان حملہ آوروں کے ساتھ ہوئی جن سے حنین واوطاس میں شدید محاربہ ہوا تھا۔ یہ لوگ ان مقامات سے شکست کھا کر قلعہ طائف میں متحصن ہو گئے تھے اور ابھی ان کی فوجی طاقت زوروں پر تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چند روز کے بعد حضورؐ کو معلوم ہوا کہ دشمن محاصرہ کی شدت سے سخت تکلیف میں ہے۔ بھوک نے ان کی ہلاکت کو بہت قریب کر دیا ہے۔ حضورؐ نے محاصرہ اٹھا دینے کا حکم دے دیا۔ چند صحابہؓ نے جنگی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے عرض بھی کیا کہ اب تو قلعہ فتح ہی ہونے والا ہے۔ مگر حضورؐ نے ازراہِ رحم وکرم جو حکم دیا تھا، اس کی تعمیل کرائی۔

ان نظائر سے واضح ہو جاتا ہے اور ایسے نظائر اور بھی بہت ہیں کہ قلبِ رحیم اور طبعِ کریم پر اہلِ محاربہ کی حالتِ زبوں اور انجامِ دگرگوں کا کیا اثر ہوا کرتا تھا۔

اہل اسلام کے متعلق حضورؐ کی رحمت وشفقت کا بیان بے پایاں ہے۔

عبادات ومعاملات میں ایسی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں کہ اُمت کو دشواری سے بچانے کے لیے یا اُمت کی آسانی کے لیے حضورؐ کیا کچھ توجہ فرمایا کرتے تھے۔ یعنی اُمت کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور اُمت کی راحت کو اپنی راحت قرار دے رکھا تھا۔

شبِ معراج کو پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے کہا، ''آپ کی اُمت میں اتنی عبادت کی طاقت نہیں'' تب حضورؐ نے رجوع الی اللہ فرمایا۔ تخفیف ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے پھر بھی حضورؐ کو وہی کہا جو پہلے کہا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہر بار رجوع الی اللہ فرماتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ نمازیں رہ گئیں۔

صلوٰۃ التراویح کے متعلق صحیحین اور سنن میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے دو شب یہ نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی اور تیسری شب کو حضورؐ مسجد میں اس نماز کے لیے تشریف نہ لے گئے اور پھر صبح کو لوگوں سے فرمایا:

''اس نماز کے لیے تمہارا آنا، انتظار کرنا وغیرہ میں نے دیکھا، مجھے آنے
میں صرف یہ خیال مانع ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔''

ام المومنین حضرت عائشہ طیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے شیوہ عمومی کو ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے:

''نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم ایسے عمل کو بھی چھوڑ دیتے جس کا کرنا حضورؐ کو پسند ہوتا، اس خیال سے کہ لوگ بھی عمل کرنے لگیں گے اور ڈر

ہونا کہ کہیں وہ عمل فرض نہ ٹھہرایا جائے۔"

ان جملہ روایات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ کی صفت حضورؐ میں کیسی مستحکم تھی اور امت کی تکلیف کا خیال حضورؐ پر کس قدر شاق تھا۔

یہ محبت، یہ شفقت، یہ ترحم، یہ پیار تو ماں باپ کو بھی اپنی سب اولاد کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا جو حضورؐ کو اپنے ہزار در ہزار اور اُلوف در اُلوف افراد اُمت کے ساتھ تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا دامن اغراض کے گرد وغبار سے بلند تر تھا، حضورؐ کی تعلیم اور تعلیم کے لیے بے حد سرگرمی کسی ذاتی مفاد پر مبنی نہ تھی۔ انتقام اور دیگر رذائل سے حضورؐ کے اخلاقِ عالیہ پاک وصاف تھے، یعنی حضورؐ کی آرزو اپنے نفس کے لیے کچھ بھی نہ تھی۔ حضورؐ کا پیکر محبتِ کُل تھا اور حضورؐ کا وجود منفعتِ عامہ اور جودِ عامہ کی صفات سے متشکل و مُجسم تھا۔

ذرا حضورؐ کی اُن ادعیہ پر نظر ڈالو، جو وقتاً فوقتاً حضورؐ نے اُمت کے حق میں فرمائی ہیں۔ وفات سے ایک ماہ پیشتر ایک خطبے کے آغاز میں فرمایا کہ مسلمانو! اللہ تمھیں سلامتی سے رکھے؛ تمھاری حفاظت فرمائے؛ تمھیں شر سے بچائے؛ تمھاری مدد کرے؛ تم کو بلند کرے؛ ہدایت اور توفیق دے؛ اپنی پناہ میں رکھے؛ آفتوں سے بچائے؛ تمھارے دین کو تمھارے لیے محفوظ بنائے۔

ذرا ان الفاظ پر غور کرو، ایک کے بعد دوسری دعا اور دوسری کے بعد تیسری، گویا دعا و برکت دیتے تھکتے ہی نہیں۔

دنیا میں ہزاروں نامور اشخاص گزرے ہیں، جو آسمانِ شہرت پر روشن انجم ہو کر چمکے۔ ان کے خطابات سے ان کی شخصیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔

کسی کا لقب مہاراجہ ادھیراج ہے۔ کوئی شہنشاہ کہلاتا ہے۔ کوئی مہادیو۔

کوئی مہابلی، کوئی تہمتن، کوئی روئین تن، کوئی گئوپال، کوئی فرزند نور، کوئی یودھا (بمعنی بیدار) کوئی سولہ کلاں سپورن، کوئی چندر بنسی، کوئی سورج بنسی وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس جیسے دیگر خطابات اس شخص کی اپنی ذات و اوصاف کے متعلق ایک نمایاں خصوصیت کے مظہر ہیں، لیکن ایسے خطابات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ دنیا بھر کی مخلوقات سے اس ہستی کو کیا نسبت ہے۔

لیکن رحمۃ للعالمین ایسا خطاب ہے جو صرف اسی نسبت اور تعلق کا مظہر ہے جو ممدوح الوصف کو مخلوقات کے ساتھ ہے۔

رحمت کے معنی پیار، ترس، دیا، ہمدردی، غم گساری، محبت اور خبر گیری ہیں۔ ان الفاظ کے معانی اس لفظ کے اندر پائے جاتے ہیں۔

کون شخص ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے مندرجہ بالا اخلاق کی کچھ ضرورت نہیں اور وہ ان اوصاف کے فیوض سے مستغنی رہ سکتا ہے۔ غالباً کوئی بھی ایسا شخص نہیں نکلے گا۔

بے شک حضورؐ کی رحمت رب العالمین کے بعد ہر ایک رحم کرنے والے اور محبت کرنے والے سے برتر اور بڑھ کر تھی۔
(رحمۃ لِّلعالمینؐ: جلد سوم)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے:

(i) قاضی محمد سلیمان سلمان کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ii) قاضی صاحب کے آباواجداد سلاطین مغلیہ میں کس عہدے پر فائز تھے؟

(iii) قاضی صاحب کن کن سرکاری عہدوں پر فائز رہے؟

۲۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے حالاتِ زندگی مختصراً قلم بند کیجیے۔

۳۔ قاضی صاحب کا انداز بیان عالمانہ نہیں بلکہ دوستانہ ہے۔اس کے باوجود قاری کو ان کے علم کی گہرائی متاثر کرتی ہے۔ بحث کیجیے۔

۴۔ رحمۃ لِلّعالمین صلّی اللہ علیہ والہ وسلّم پر مختصر مگر جامع مقالہ لکھیے۔

۵۔ نبی کریمؐ نے اپنی امت کے لیے کیا کیا دعائیں فرمائیں؟

۶۔ تیسری شب کو حضورؐ نمازِ تراویح کے لیے مسجد تشریف کیوں نہ لائے؟

۷۔ آپؐ کا لقب ''رحمۃ لِلّعالمین'' دیگر مشاہیر کے القاب سے کیونکر جامع تر ہے؟

۸۔ مندرجہ ذیل خالی جگہ پر کیجیے۔

(i) اہل اسلام کے متعلق حضورؐ کی رحمت وشفقت کا بیان............ ہے۔

(ii) قحط اس شدت کا تھا کہ اہل مکہ کی................ بھی کم ہوگئی۔

(iii) انتقام اور دیگر رذائل سے حضورؐ کے................ پاک وصاف تھے۔

(iv) نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کا دامن اغراض کے................ سے بلند تر تھا۔

(v) بے شک حضورؐ کی رحمت رب العالمین کے بعد ہر ایک رحم کرنے والے اور محبت کرنے والے سے............ کرتھی۔

۸۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کیجیے:

استراحت گزیں، بادل نخواستہ، طبع کریم، ازراہِ رحم وکرم، انجامِ دگرگوں، حالتِ زبوں،
اخلاقِ عالیہ، شیوہ عمومی، برسرِ پرخاش، شفقت ورافت، اکراہ واجبار، اُلوف دراُلوف

☆☆......☆☆......☆☆

مولوی عبدالحق

ولادت: ۱۸۷۰ء وفات: ۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ ہی میں حاصل کی۔ پھر علی گڑھ سے بی۔ اے کیا، کچھ دن صوبہ پنجاب میں رہنے کے بعد ریاست حیدرآباد میں تعلیمی محکمے میں ملازم ہو کر ترقی کرتے رہے۔ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوگئے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو ہوگئے۔ انجمن ترقیٔ اردو کے روحِ رواں تھے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم یونیورسٹی سے ان کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔

مولوی صاحب کو اردو زبان سے شروع ہی سے ایک خاص انسیت تھی، اس کی خاطر انھوں نے بڑی مشقتیں اٹھائیں اور اردو کی بے پناہ خدمت کی۔ چوں کہ انجمن ترقیٔ اردو کے سیکرٹری تھے اس لیے انجمن کی ہر کتاب پر باقاعدہ مقدمات لکھے اور بے لاگ تبصرہ کیا۔ اس سے مولوی صاحب کی اعلیٰ علمی قابلیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی تحریروں کے علاوہ ایک اور کارنامہ ان کے لیے مایہ ناز ہے، وہ انگریزی اردو ڈکشنری کا مرتب کرانا اور اردو قواعد کو انگریزی قواعد کے طرز پر لکھنا ہے۔ اردو ادب میں مولوی عبدالحق صاحب ایک نقاد، مقدمہ نگار اور وسیع النظر انشاپرداز تھے۔ قدیم اردو کے بارے میں صحیح اور وسیع معلومات فراہم کرنا ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

مولوی صاحب کے طرزِ تحریر میں بے ساختگی اور ستھراپن ہے۔ ہندی الفاظ بھی جا بجا اردو میں استعمال کرتے ہیں مگر بڑی خوب صورتی سے۔ ان کی تحریروں میں بول چال کی زبان نظر آتی ہے اور حالی کی طرح ایک پرخلوص انداز ملتا ہے۔ مگر حالی کی طرح ان کے یہاں ظرافت کا فقدان نہیں ہے، اس سے ان کی تحریروں میں دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

مولوی صاحب قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ یہاں بھی اردو زبان و ادب کے فروغ میں منہمک رہے۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں ان کی خدمات بڑی اہم ہیں۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی خاطر انھوں نے کراچی میں اردو کالج قائم کیا۔ آج بھی اس کالج میں ایم۔ اے، ایم۔ ایس سی کی سطح تک ذریعۂ تدریس اردو ہے۔

انھوں نے ان اہم لوگوں کی وفات پر جن سے کہ ان کے مراسم رہے تھے جو مضامین لکھے ہیں، وہ خاکہ نگاری کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کتاب میں شامل مضمون ''مولانا حالی'' ان کے خاکوں کے مجموعے ''چند ہم عصر'' سے لیا گیا ہے۔

مولانا حالی

غالباً ۱۸۹۲ء یا ۱۸۹۳ء کا ذکر ہے جب میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ میں طالب علم تھا، مولانا حالی اس زمانے میں یونین کے پاس کی بنگلیا میں مقیم تھے۔ میں ان تعطیلوں کے زمانے میں وطن نہیں گیا اور بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہا۔ اکثر مغرب کے بعد کچھ دیر کے لیے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ''حیاتِ جاوید'' کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ہی ساتھ ''یادگارِ غالب'' کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔ انھیں دنوں میں میرے ایک عزیز میرے ہاں مہمان تھے۔ میں جو ایک دن مولانا کے ہاں جانے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ہو لیے۔ کچھ دیر مولانا سے بات چیت ہوتی رہی۔ لوٹتے وقت رستے میں مہمانِ عزیز فرمانے لگے کہ ملنے سے اور باتوں سے تو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی مولوی حالی ہیں جنھوں نے ''مسدّس'' لکھا ہے۔ یہ مولانا کی فطری سادگی تھی جو اس خیال کا باعث ہوئی۔

ایک دوسرا واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور جس کا ذکر میں نے کسی دوسرے موقع پر کیا ہے۔ یہ ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب کہ غفران مآب اعلیٰ حضرت مرحوم کی جوبلی بلدۂ حیدرآباد اور تمام ریاست میں بڑے جوش اور شوق سے منائی جا رہی تھی۔ مولانا حالی بھی اس جوبلی میں سرکار کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے۔ زمانۂ قیام میں اکثر لوگ صبح سے شام تک ان سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب، جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے، زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے، مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے: ہائے ظالم نے کیا کیا! اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے: یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔

مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں: ایک سادگی دوسری دردِ دل اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے یا یوں سمجھیے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

مجھے اپنے زمانے کے بعض نامور اصحاب سے اور اپنی قوم کے اکثر بڑے بڑے شخصوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن مولانا حالی جیسے پاک سیرت اور خصائل کا بزرگ مجھے ابھی تک کوئی نہیں ملا۔ نواب عماد الملک فرمایا کرتے تھے کہ سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا حالی کا پایہ بہت بلند تھا، اس بات میں سرسید بھی انھیں نہیں پہنچتے تھے۔

خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے جھک کر اور خلوص سے ملتے تھے۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا، خوش ہو کر جاتا اور عمر بھر ان کے حُسنِ اخلاق کا مدّاح رہتا تھا۔ ان کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے

میں ایک بار جب وہ علی گڑھ میں مقیم تھے، میں اور مولوی حمید الدین مرحوم ان سے ملنے گئے تو سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے: آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں، آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔

مولانا بہت ہی رَقِیْقُ الْقَلْب تھے۔ دوسرے کی تکلیف کو دیکھ کر بے چین ہو جاتے تھے اور جہاں تک اختیار میں ہوتا اس کے رفع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حاجت مندوں کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتے تھے۔ باوجودیکہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ بامُروّت ایسے تھے کہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس قلیل آمدنی پر بھی حاجت مندان کے ہاں سے محروم نہیں جاتے تھے۔

تَعَصُّب ان میں نام کو نہ تھا۔ ہر قوم و ملّت کے آدمی سے یکساں خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جب کبھی ہندو مسلم نزاع کا کوئی واقعہ سنتے تھے تو انھیں بہت رنج اور افسوس ہوتا تھا۔ تحریر و تقریر میں تو کیا، نج کی اور بے تکلفی کی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ ایسا سننے میں نہیں آیا جو کسی فرقے کی دل آزاری کا باعث ہو بلکہ اگر کوئی ایسی بات کہتا تو برا مانتے اور نصیحت کرتے تھے۔ بے تعصبی کا وصف انھیں لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔

نام و نمود چھو کر نہیں گیا تھا۔ ورنہ شہرت وہ بدبَلا ہے کہ جہاں یہ آتی ہے کچھ نہ کچھ شیخی آ ہی جاتی ہے۔ ہمارے شاعروں میں تو تعلّی عیب ہی نہیں رہی بلکہ شیوہ ہو گئی ہے۔ وہ سیدھی سادی باتیں کرتے تھے اور جیسا کہ عام طور پر دستور ہے باتوں باتوں میں شعر پڑھنا، بحث کرکے اپنی فضیلت جتانا یا اشارے کنائے میں دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی دکھانا، ان میں بالکل نہ تھا۔ ہاں شعر میں البتہ کہیں کہیں تَعَلّی آ گئی ہے مگر وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ خاکساری کا پہلو وہاں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

ان کا ذوقِ شعر اعلیٰ درجے کا تھا۔ جیسا کہ ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب'' اور ''مقدمۂ شعر و شاعری'' سے ظاہر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح ذوق پیدا کرنے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے لیکن وہ خواہ مخواہ اس کی نمائش نہیں کرنا چاہتے تھے، ہاں جب کوئی پوچھتا یا اتفاق سے بات آ پڑتی تو وہ کھل کر اس کے نِکات بیان کرتے تھے۔

ہمارے ہاں یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب کبھی کوئی کسی شاعر سے ملتا ہے تو اس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ شاعر تو شاعر سے اس لیے فرمائش کرتا ہے کہ اسے بھی اپنا کلام سنانے کا شوق گدگداتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کا مخاطب بھی اس سے یہی فرمائش کرے گا اور بعض اوقات تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، بغیر فرمائش ہی اپنے کلام سے محظوظ فرمانے لگتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس لیے فرمائش کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاعر ان سے اس کی توقع رکھتا ہے لیکن بعض لوگ سچے دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ کسی بڑے شاعر کا کلام اس کی زبان سے سنیں۔ لوگ مولانا حالی سے بھی فرمائش کرتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹال جاتے تھے اور اکثر یہ عذر کر دیتے تھے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے، اپنا لکھا بھی یاد نہیں رہتا۔ یہ محض عذر لنگ ہی نہ تھا، اس میں کچھ حقیقت بھی تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ خود نمائی سے بہت بچتے تھے۔

جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدرآباد میں تھا، ایک دن گرامی مرحوم نے چائے کی دعوت کی۔ چند اور احباب کو بھی بلایا۔ چائے وغیرہ کے بعد جیسا کہ معمول ہے فرمائش ہوئی کہ کچھ اپنا کلام سنایے۔ مولانا نے وہی حافظے کا عذر کیا۔ ہر چند لوگوں نے کہا کہ کچھ بھی جو یاد ہو فرمایے مگر مولانا عذر ہی کرتے رہے۔ اتنے میں ایک صاحب کو خوب سوجھی وہ چپکے سے اُٹھے اور کہیں سے ''دیوانِ حالی'' لے آئے

اورلا کے سامنے رکھ دیا۔ اب مجبور ہوئے کوئی عذر نہیں چل سکتا تھا۔ آخرانھوں نے یہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

آج کل تو ہمارے اکثر شاعرلَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں، ان کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں، ان میں بعض طرح طرح سے چشم وابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے۔ البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے تھے کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحیدالدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیم صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا، نظم ان کے ہاتھ سے لے لی اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کُہرام مچ گیا۔

سرسید تو خیر اس زمانے میں موردِ لعن وطعن تھے ہی اور ہر کس وناکس ان کے منہ آتا تھا لیکن اس کے بعد جس پر سب سے زیادہ اعتراضات کی بوچھاڑ پڑی وہ حالی تھے۔ ایک تو وہ ہر شخص جس کا تعلق سرسید احمد خاں سے تھا، یوں بھی مردود سمجھا جاتا تھا، اس پر ان کی شاعری جو عام رنگ سے جدا تھی اور نشانۂ ملامت بن گئی تھی اور ''مقدمۂ شعروشاعری'' نے تو خاصی آگ لگادی۔ اہلِ لکھنؤ اس معاملے میں چھوئی موئی سے کم نہیں۔ وہ معمولی سی تنقید کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ انھیں یہ وہم ہوگیا تھا کہ یہ ساری کارروائی انھیں کی مخالفت میں کی گئی ہے۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے نکتہ چینی اور طعن وتعریض کی صدا آنے لگی۔ ''اودھ پنچ'' میں ایک طویل سلسلہ مضامین ''مقدمہ'' کے خلاف مدت تک نکلتا رہا جو ادبی تنقید کا عجیب وغریب نمونہ تھا۔ وہ صرف بے تکے اور مہمل اعتراضات ہی کا مجموعہ نہ تھا بلکہ پھکڑ اور پھبتیوں تک نوبت پہنچ گئی تھی، جن مضامین کا عنوان:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

ہو تو اس سے سمجھ لیجیے کہ اس عنوان کے تحت کیا کچھ خرافات نہ بکی گئی ہوگی۔ مولانا یہ سب کچھ سہتے رہے لیکن کبھی ایک لفظ زبان سے نہ نکالا:

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن آخر ایک وقت آیا کہ نکتہ چینوں کی زبانیں بند ہوگئیں اور وہی لوگ جو انھیں شاعر تک نہیں سمجھتے تھے ان کی تقلید کرنے لگے:

غُل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

مخالفت سہنے کا ان میں عجیب وغریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے لیکن حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا لیکن ضبط سے کام لیتے تھے۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے

اُوصاف تھے اور یہ دو خوبیاں ان کے کلام میں بھی کامل طور پر پائی جاتی ہیں ورنہ جوش میں آ کر آدمی سر رشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلاّنے لگتا ہے۔

ان کا ایک نواسہ تھا۔ ماں اس کی بیوہ تھی اور اس کا یہ ایک ہی لڑکا تھا۔ اکلوتا لڑکا بڑا لاڈلا ہوتا ہے۔ اس پر ایک آفت یہ تھی کہ صَرَع کی بیماری میں مبتلا تھا اس لیے ہر طرح اس کی خاطر اور رضا جوئی منظور تھی۔ وہ مولانا کو بہت دق کرتا مگر وہ اف تک نہ کرتے۔ وہ اینڈے بینڈے سوال کرتا، یہ بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ وہ فضول فرمائشیں کرتا، یہ اس کی تعمیل کرتے۔ وہ خفا ہوتا اور بگڑتا، یہ اس کی دل دہی کرتے، وہ روٹھ جاتا، یہ اسے مناتے، وہ لڑ کر گھر سے بھاگ جاتا، یہ اسے ڈھونڈتے پھرتے۔ پانی پت سے کہیں باہر جاتے تو وہ انھیں دھمکی کے خط لکھتا، یہ شفقت آمیز خط لکھتے اور سمجھاتے بجھاتے۔ کچھ اس کی بیماری کا خیال اور کچھ اس کی دکھیا ماں کا پاس، وہ سب سے زیادہ اس پر شفقت فرماتے اور اس کی ہٹ، خفگی، روٹھنے مچلنے کو سہتے اور کبھی آزردگی یا بیزاری کا اظہار نہ کرتے۔ اگر چہ جوان ہو گیا تھا مگر مزاج اس کا بچوں کا سا تھا۔ سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار اس نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ گر پڑے۔ کہیں خواجہ سجاد حسین صاحب نے دیکھ لیا۔ وہ بہت برہم ہوئے اور شاید اس کے ایک تھپڑ مار دیا۔ مولوی صاحب اس پر سخت ناراض ہوئے اور خواجہ صاحب سے بات چیت کرنی موقوف کر دی اور جب تک انھوں نے اس لڑکے سے معافی نہیں مانگی، ان سے صاف نہ ہوئے۔

مولانا نے دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہیں کی۔ جس حالت میں تھے اس پر قانع تھے اور خوشی خوشی زندگی بسر کرتے تھے اور اس میں اوروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ ان کی قناعت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں عربک اسکول میں ساٹھ روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ جب حیدر آباد میں ان کے وظیفے کی کارروائی ہوئی تو انھوں نے ساٹھ سے زیادہ طلب نہ کیے جس کے تخمیناً پچھتر حالی[1] ہوتے ہیں۔ ایک مدت تک پچھتر ہی ملتے رہے، بعد میں پچیس کا اضافہ ہوا۔ ریاست حیدر آباد سے معمولی معمولی آدمیوں کو بیش قرار وظیفے ملتے ہیں۔ وہ چاہتے تو کچھ مشکل نہ تھا، مگر انھوں نے کبھی زیادہ کی ہوس نہ کی اور جو ملتا تھا اس کے لیے وہ بہت شکر گزار تھے۔

غالباً سوا ایک آدھ کے انھوں نے کبھی اپنی کسی کتاب کی رجسٹری نہ کرائی۔ جس نے چاہا چھاپ لی۔ ان کی تصانیف مال یغما تھیں۔ ''مسدس'' تو اتنا چھپا کہ شاید ہی کوئی کتاب چھپی ہو۔ یہ کیسی سیر چشمی اور عالی ظرفی کی بات ہے خصوصاً ایسے شخص کے لیے جس کی آمدنی محدود اور بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے کم ہو۔

مُروّت کے پتلے تھے۔ جب تک خاص مجبوری نہ ہوتی کسی کی درخواست رد نہیں کرتے تھے۔ وقت بے وقت لوگ آ جاتے اور فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے۔ وہ بیٹھے سنا کرتے لیکن محض دل آزاری کے خیال سے یہ نہ ہوتا کہ خود اٹھ کر چلے جاتے یا کنایۃً اشارۃً کوئی ایسی بات کہتے کہ لوگ اٹھ جاتے۔ حیدر آباد کے قیام میں، میں نے اس کا خوب تماشا دیکھا۔

اسی طرح طبیعت میں حیا بھی تھی۔ جس سال حیدر آباد تشریف لائے، سرسید کی برسی کا جلسہ بھی انھیں کی موجودگی میں ہوا۔ ان سے خاص طور سے درخواست کی گئی کہ اس جلسہ کے لیے سرسید کی زندگی پر کوئی مضمون پڑھیں۔ نواب عماد الملک بہادر صدر تھے۔ مولانا نے اس موقع کے لیے بہت اچھا مضمون لکھا تھا۔ مضمون ذرا طویل تھا، پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی، اس لیے آخری حصہ چھوڑ دیا۔ قیام گاہ پر واپس آ کر

۱۔ شروع میں ریاست حیدر آباد دکن کے سکّے کا نام ''چلنی'' تھا۔ بعد میں اس سکّے کو ''حالی'' کہنے لگے۔ ''چلنی'' اور ''حالی'' میں مالیت کا تفاوت بھی موجود تھا۔ غالبؔ کے ایک حیدر آبادی شاگرد، حبیب اللہ ذکاء نے ایک زمانے میں ریاست کے خزانہ عامرہ کے ناظم فخر الدین حیدر کی جو ہجو لکھی تھی، اس میں بھی ان دونوں سکّوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہاں بھی 'حالی' سکّے کے معنی میں مستعمل ہے۔ (ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر)

فرمانے لگے کہ میرا گلا بالکل خشک ہو گیا تھا اور حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے، اچھا ہوا اندھیرا ہو گیا ورنہ اس سے آگے ایک لفظ نہ پڑھا جاتا۔ میں نے کہا: وہاں پانی شربت وغیرہ کا سب انتظام تھا، آپ نے کیوں نہ فرمایا، اسی وقت پانی یا شربت حاضر کر دیا جاتا۔ کہنے لگے: اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔

جب کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ قدر دانی کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے تھے۔ ''پیسہ اخبار'' جب روزانہ ہوا تو سب سے پہلے مولانا نے مبارک باد کا تار دیا۔ مولوی ظفر علی خاں کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں نظم لکھی۔ ''ہمدرد'' اور مولانا محمد علی کی مدح سرائی کی اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو قابلِ اعتراض ہوتی تو بڑی ہمدردی اور شفقت سے سمجھاتے اور اس کا دوسرا پہلو سجھاتے۔ ان کے خطوں میں ایسے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر اس بات سے بہت ناراض ہوتے تھے کہ مولانا داد دینے اور تعریف کرنے میں بہت فیاضی برتتے ہیں جس سے لوگوں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن اس کا دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ان کی ذرا سی داد سے دل کتنا بڑھ جاتا تھا اور آیندہ کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔

ہم عصروں اور ہم چشموں کی رقابت پرانی چیز ہے اور ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے۔ جہاں تک مجھے ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور بعض اوقات چھیڑ چھیڑ کر اور کرید کرید کر دیکھا اور ان کی تحریروں کے پڑھنے کا اتفاق ہوا، مولانا اس عیب سے بری معلوم ہوتے ہیں۔ محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی کی کتابوں پر کیسے اچھے تبصرے لکھے ہیں اور جو باتیں قابلِ تعریف تھیں، ان کی دل کھول کر داد دی ہے مگر ان بزرگوں میں سے کسی نے مولانا کی کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

قیام حیدر آباد میں ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا سے ملنے آئے۔ اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شایع ہوئے تھے۔ ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے، آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی، لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔

مولانا انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ بار سیکھنے کا ارادہ کیا، نہ ہو سکا لیکن حیرت یہ ہے کہ مغربی تعلیم و تہذیب کے منشا کو جیسا وہ سمجھتے تھے اس وقت بہت سے انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اور ان کی تصانیف اس کی شاہد ہیں اور جو سمجھتے تھے وہ کر کے دکھا دیا۔ آج سیکڑوں تعلیم یافتہ موجود ہیں لیکن ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی کیا ہو۔ پھر یہی نہیں کہ ہمارے شاعروں اور مصنفوں کی طرح وہ بالکل خیالی شخص تھے بلکہ جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ آدمی مفکّر بھی ہو اور عامل بھی، ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔

مولانا کمزوروں اور بے کسوں کے بڑے حامی تھے۔ خاص کر عورتوں کی، جو ہمارے ہاں سب سے بے کس فرقہ ہے، انھوں نے ہمیشہ حمایت کی۔ ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے، کوئی انھیں بے چشمِ نم پڑھ بھی نہیں سکتا۔

جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے ہے شاید وہ سمجھتے ہوں گے کہ مولانا ہر وقت روتے اور بسورتے رہتے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل درد سے لبریز تھا اور ذرا سی ٹھیس سے چھلک اٹھتا تھا، مگر ویسے وہ بڑے شگفتہ مزاج اور خوش طبع تھے، خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بھی کہیں کہیں ظرافت اور زیادہ تر طنز کی جھلک نظر آتی ہے۔

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ کوئی ان سے کیسی ہی بدمعاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کرے، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ جب ملتے تو اسی شفقت و عنایت سے پیش آتے اور کیا مجال کہ اس بدسلوکی یا بدمعاملگی کا ذکر زبان پر آنے پائے۔ اسی سے نہیں کسی دوسرے سے بھی کبھی ذکر نہ آتا۔ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم ہوگی ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب ان سے ملتے تو ان کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ پرلے درجے کے نکتہ چیں، جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں، ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں، ورنہ یوں دنیا میں پند و نصائح کی کوئی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ کیسا ہی برا زمانہ کیوں نہ ہو، دنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

(چند ہم عصر)

سوالات

۱۔ ''اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوگا''۔ اس جملے کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ مولانا حالی کی طبیعت میں خاکساری کا وصف کس حد تک تھا؟

۳۔ مولوی عبدالحق کے بیان کے مطابق مولانا حالی احباب کی شعر سنانے کی فرمائش کہاں تک پورا کرتے تھے؟

۴۔ مولانا حالی اپنے معترضین کو اپنے اوپر اعتراضات کا کیا جواب دیتے تھے؟

۵۔ خواجہ الطاف حسین حالی کا اپنے نواسے کے ساتھ کیسا سلوک تھا؟

۶۔ مولانا حالی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے؟

۷۔ مولانا حالی کی سیرت کا کوئی ایک ایسا واقعہ بیان کیجیے جس سے آپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہوں۔

۸۔ مجمل حیثیت سے مولانا حالی کے کردار کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کیجیے۔

۹۔ مطابقت کے معنی ہیں مطابق یا موافق کرنا۔ قواعدِ زبان کی رُو سے فعل کی اپنے فاعل کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور علامت اضافت کی اپنے مضاف کے ساتھ نسبت کے بدلتے ہوئے اصولوں کو مطابقت کہتے ہیں۔ جیسے: اس کے بیوی بچے آگئے۔ علم اور نیک چلنی انسان کا درجہ بڑھا دیتے ہیں۔ فوج جا رہی ہے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ قلم اور دوات یہاں رکھی ہے۔ بانس جھک کر کمان بن گیا وغیرہ۔

اس سبق سے چند جملے لے کر فعل کی اپنے فاعل کے ساتھ، صفت کی اپنے موصوف کے ساتھ اور حرف اضافت کی اپنے مضاف کے ساتھ مطابقت کی نشاندہی کیجیے۔

۱۰۔ درج ذیل اقتباسات کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کیجیے:

(الف)۔ ہمارے ہاں یہ دستور.........خودنمائی سے بہت بچتے تھے۔

(ب)۔ درگزر کا یہ عالم تھا.........مگر افسوس کہ کوئی حالی نہیں!!

مرزا فرحت اللہ بیگ

ولادت: ۱۸۸۴ء وفات: ۱۹۴۷ء

مرزا فرحت اللّٰہ بیگ دلّی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دلّی کے گورنمنٹ ہائی سکول میں پائی۔ بی۔ اے کی ڈگری سینٹ اسٹیفنز کالج سے حاصل کی۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے۔ پہلے سررشتۂ تعلیم[1] میں کام کیا، بعد میں ان کی خدمات سررشتۂ عدالت نے حاصل کر لیں اور ترقی کر کے ہوم سیکرٹری ہو گئے جہاں سے ریٹائر ہوئے اور پنشن پائی۔ ۲۷۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔

مرزا صاحب کا طرزِ تحریر سادہ اور پُر لطف ہے۔ وہ بڑے شگفتہ انداز میں لکھتے ہیں۔ دہلی کی خاص زبان لکھتے ہیں۔ اُنھیں بے جا بناوٹ سے نفرت ہے۔ جا بجا مزاح کی چاشنی سے تحریر میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ اکثر مضامین میں اصلاحِ معاشرہ کا پہلو نمایاں ہے مگر ان کا انداز کہیں بھی خشک اور بے مزہ نہیں ہونے پاتا۔ فرحت اللہ بیگ کو تصویر کشی میں ماہرانہ کمال حاصل ہے۔ جس شخص یا موقع کی عکاسی کرتے ہیں اس کی جزئیات ایسے پُر لطف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پوری تصویر پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نذیر احمد کی کہانی میں اُنھوں نے مولانا کے کردار اور شخصیت کے خط و خال اس انداز سے دکھائے ہیں کہ تصویر کھنچ گئی ہے۔

ان کے مضامین جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، ''مضامینِ فرحت'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ جن میں سے ''دلی کا یادگار مشاعرہ'' اور ''نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' کتابچوں کی صورت میں بھی طبع ہوئے ہیں۔

۱۔ محکمہ تعلیم

مرزا فرحت اللہ بیگ

ایک وصیّت کی تعمیل

میں مدت سے حیدرآباد میں ہوں۔ مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے، لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ انھیں ملنے سے فرصت نہ تھی۔ مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ گذشتہ سال کالج کے جلسے میں مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لیے جو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ طالب علم بھی ہیں، ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں۔ کچھ بے ضرورت چلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مہمان ہیں، کچھ بن بلائے مہمان ہیں۔ غرض یہ کہ آدھی ریل انھی اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی۔ سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے غپیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے، بڑے بڑے ڈگ بھرتے، میری طرف چلے آ رہے ہیں۔ متوسط قد، بھاری گٹھیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت، اس پر سفید چھوٹی سی گول ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پائجامہ، کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا۔ آئے اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ کیا امیر حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں، اس وقت انھوں نے فرمایا: میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمھارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے، کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں، مگر موقع نہ ملا۔ قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی! مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا۔

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا: مولوی صاحب! گھبراتے کیوں ہیں۔ بسم اللہ کیجیے، مرجایے مضمون میں لکھ دوں گا۔

کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی، میں نے معذرت کی۔ وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے۔ رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہوگئے کہ جس گاڑی میں تو ہے، میں بھی اسی میں بیٹھوں گا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کا سامان لا، میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی، اور ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے، ایک بجا، دو بج گئے، مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اول میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب، میں اور رفیق بیگ۔ رفیق بیگ تو سو گئے ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کیے، اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا، اصطلاحاتِ زبانِ اردو پر بحث ہوتی رہی، شعر و شاعری ہوئی، دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں، اپنی تعریفیں ہوئیں، مولوی عبدالحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے زبردستی کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی گھنٹا بھر سوئے ہوں گے کہ ان کے شاگردوں اور ساتھیوں نے گاڑی پر یورش کر دی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے، پھبتیاں اڑیں، اس کو بے وقوف بنایا، اس کی تعریف کی، ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب مسعود جنگ اپنے پاس لے

گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑا رہا۔

میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی کوشش کی کہ مولوی صاحب کی طبیعت کا اندازہ لگاؤں۔ پہلے تو ذرا بند رہے لیکن آخر میں کھل گئے۔ میں نے جو رائے ان کے متعلق قائم کی ہے، وہ سن لیجیے۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا۔ لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ کسی کو بُرا بھی کہتے تو ایسے الفاظ میں کہتے کہ سننے سے تکلیف ہوتی، اور جب کہنے پر آتے تو پھر یہ نہ دیکھتے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ نتیجہ اکثر یہ ہوتا کہ لوگ ادھر سے ادھر لگا دیتے اور مولوی صاحب کی کسی نہ کسی سے بگڑ جاتی۔ شاید ہی کوئی بھلا آدمی ہوگا جو سچے دل سے ان کو چاہتا ہو۔ ان کے علم، ان کی سمجھ، ان کی زود فہمی اور ان کی طبع رسا کی سب تعریف کرتے ہیں لیکن ان کی طبیعت کے سب شاکی ہیں اور وہ خود بھی اس سے بیزار تھے۔

بات یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی وہ ٹھوکریں کھائی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ خاصا بھلا چنگا آدمی دیوانہ ہو جائے۔ اگر مولوی صاحب کی طبیعت پر ان مصیبتوں نے اتنا اثر کیا تو کیا تعجب ہے۔ جب کسی نااہل کو بڑی خدمت پر دیکھتے تو ان کے آگ لگ جاتی۔ ریل میں دو ایک بڑے شخصوں کا ذکر آیا، انھوں نے ہر دفعہ یہی کہا: ارے میاں! گدھا ہے، ایک سطر صحیح نہیں لکھتا، اور دیکھو تو کون ہیں کہ نواب صاحب، ہم کو دیکھو تمام عمر علم حاصل کرنے میں گزار دی۔ اس اخبار کی اڈیٹری کی، اس رسالے کے منیجر ہوئے، سرسید کی خدمت میں سرگاڑی، پاؤں پہیہ کیا، اب جو چند روپلی مل رہے ہیں، تو فلاں صاحب جلے جاتے ہیں، خبر نہیں کچھ ہوتے تو گلا ہی گھونٹ دیتے۔

میں نے کہا: ''مولوی صاحب! یہ دنیا ہے آخرت نہیں ہے کہ جیسا بوؤ گے ویسا پھل ملے گا۔ یہاں اہلِ کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا دل جلاتے ہیں۔ جو اللہ نے دیا ہے بہت ہے، آگے ناتھ نہ پیچھے پگّا۔ مزے کیجیے۔ بہت گزر گئی ہے، تھوڑی رہی ہے، ہنسی خوشی یہ بھی گزار دیجیے۔''

وہ بھلا میری باتوں کو کیا سننے والے تھے، ان کے تو دل میں زخم تھے۔ تمام عمر مصیبت اٹھائی تھی، نااہلوں کو آرام و آسائش میں دیکھ کر وہ زخم ہرے ہو جاتے تھے۔ زبان اپنی تھی، کسی کا دینا نہیں آتا تھا۔ بے نقط سنا کر دل ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

زمانے کے ہاتھوں ان کی طبیعت میں ایک دوسرا انقلاب یہ بھی ہو گیا تھا کہ جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔ جتنی ان کے قلم میں روانی پیدا ہوئی، اتنی ہی ان کی مٹھی بند ہوئی۔ میں ان کے پیٹھ پیچھے نہیں کہتا، جب ان کے منہ پر کہہ چکا ہوں کہ مولوی صاحب! آپ کی کفایت شعاری نے بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر لی ہے، تو اب لکھتے کیوں ڈروں۔ واقعی بڑے کنجوس تھے۔ ہزار روپے کے گریڈ میں تھے۔ دارالترجمہ سے بہت کچھ مل جاتا تھا مگر خرچ کی پوچھو تو صفر سے کچھ ہی زیادہ ہوگا۔ اس کی صراحت، میں آگے چل کر، کروں گا۔ ہاں، ان کا یہ عذر سب کو ماننا پڑے گا کہ مفلسی کے پے در پے حملوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس خدمت پر کب تک ہیں اور کب نکال دیے جائیں گے۔ خشک سالی کے اندیشے سے ارزانی کے زمانے میں کٹھے بھرنے کی فکر میں رہے۔ خود چل بسے اور جمع پونجی دوسروں کے لیے چھوڑ گئے۔ اور چھوڑ بھی اتنی گئے کہ بعض لوگوں کو افسوس ہوا کہ ہم ان کے بیٹے کیوں نہ ہوئے۔

بہر حال یونہی ہنستے، بولتے دو بجے اورنگ آباد پہنچ گئے۔ بڑے زور کا استقبال ہوا۔ موٹروں میں لد کر اورنگ آباد کالج پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک خیمے ہی خیمے لگے ہیں۔ خیموں کے سامنے جلسے کا منڈوا ہے۔ منڈوے کے سامنے جو خیمہ تھا اس میں مجھے اور مولوی صاحب کو جگہ ملی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بدمزہ تھی۔ راستے کی تکان اور رات بھر کے جاگنے سے اور خراب ہوگئی، بخار چڑھ آیا۔ دو وقت کھانا نہیں کھایا، تیسرے وقت بڑے کہنے سننے سے تھوڑا سا دودھ پیا۔ دوسرے روز ان کا لکچر تھا۔ طبیعت صاف نہیں تھی پھر بھی بڑے میاں کو جوش آ گیا۔ ٹرنک میں سے جوڑا نکالا، ریشمی شیروانی نکالی، نئی ٹوپی، اپنا میلا کچیلا جوڑا پھینک، نیا پہن اس ٹھاٹھ سے جلسے میں آئے کہ واہ واہ۔ کھڑے ہو کر لکچر دینے کا دم نہ تھا، اسٹیج پر کرسی بچھا دی گئی۔ انھوں نے جیب میں سے چھوٹے چھوٹے پیلے کاغذ کے پرچوں کی ایک گڈی نکالی اور لکچر پڑھنا شروع کیا۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ اسپیچ کے پڑھنے میں الفاظ کا زور کم ہو جاتا ہے مگر مولوی صاحب کے طرز ادا نے میرا خیال بالکل بدل دیا۔ ان کے پڑھنے میں بھی وہی بلکہ اس سے زیادہ زور تھا، جتنا بولنے میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ تقریباً دو ہزار آدمی کا مجمع تھا مگر سناٹے کا یہ عالم تھا کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ لفظوں کی نشست، زبان کی روانی، آواز کے اتار چڑھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ یا ایک برقی رو ہے کہ کانوں سے گزر کر دل و دماغ پر اثر کر رہی ہے۔ برس روز ہو چکا ہے مگر اب تک وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے بڑے بڑے لیکچر دینے والوں کو سنا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لیکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا، میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لیکچر انھیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو یہ لیکچر پڑھتے پڑھتے خود منجھ گئے تھے یا یہ ان کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو اس میں ان کا مدِ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اسی روز ایک واقعہ پیش آیا کہ اس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان، وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام کے لیے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا، گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہوگئی اور لوگوں میں ذرا اہل چل ہونے لگی۔ مجھے اس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا: ''یارو! ذرا جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے، مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں، تمھارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا، میں اپنی اسپیچ ختم کر دوں گا۔'' اتنا کہہ کر میں چٹ باہر پردے کے سامنے آ گیا۔ مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کو ذرا مذاق میں ادا کروں۔

جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے، وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مؤلف ''طبقات الشعرائے ہند'' سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انھی کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے لیکچر میں ابتداً اس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں، ان کے خاک آلودہ کپڑوں، ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ

گیا۔ پھر ان کے دہلی میں آکر تعلیم پانے، مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے، دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعرا اس میں جمع ہوئے۔

میں اسپیچ دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا، کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں۔ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین سلیم کی طرف ہو گیا۔ مجھے تو معلوم نہیں، مگر جلسے میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لیے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے کہ مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے یکساں ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی، اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟''

مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو، دل ہی دل میں اونٹتے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازے سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں، مجھے دیکھتے ہی بھر گئے۔ کہنے لگے: ''فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے۔ کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا۔'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا، پان بنا کر دیا، سگریٹ پیش کیا۔ جب جا کر ذرا نرم پڑے اور واقعہ بیان کیا۔

میں نے کہا: مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اول تو اس مذاق کا یہ موقع ہی کیا تھا، دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے، کہاں کے تھے، دہلی آئے بھی تھے یا نہیں، کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے۔

کہنے لگے: ''تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا۔'' میں نے کہا ''مولوی صاحب! اسپیچ دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بہ خود اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارے کو اپنے سے متعلق کر لیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

بہر حال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا: ''مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟'' یہ کبھی تو ہنس کر چپ ہو جاتے، کبھی صرف جھڑک دیتے، کبھی جل کر کہتے ''جی ہاں، میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے۔''

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا ان کے ہاں آنا جانا بہت ہو گیا تھا۔ جب کچھ لکھتا، پہلے ان کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے، تعریفیں کرتے، دل بڑھاتے۔ ہائے ان کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ گھر بہت بڑا تھا، مگر خالی ڈھنڈار، ساٹھ روپے مہینا کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے نہ بال نہ بچہ نہ نوکر، نہ ماما۔ میں گیا، باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی: ''کون؟''

میں نے کہا: ''فرحت۔'' اسی وقت کرتا پہنتے ہوئے آئے، دروازہ کھولا، اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے، دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے، اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چوہا چکٹ تکیے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ کنڈا ٹوٹی چائے کی پیالیاں، کنارے جھڑی رکابیاں، ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں، دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے کھڑ نک جوتوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ لیجیے، مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ

خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی، دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے، خود پی رہے ہیں، دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے، چائے بنائی، نمک کے ڈلے کو ڈال، دو ایک چکر دے، نکال لیا۔ بس سارے دن ان کا یہی شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے، کھانا کیسے پکتا اور کون پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جا کر کھا پی آتے تھے۔ کبھی میں گیا، دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے، سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا بھی کہ مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں، کہنے لگے: ''نہیں بھئی میں نے تو مدتوں سے کھانا چھوڑ دیا ہے، صرف چائے پر گزران ہے۔''

تم مان لو، میں تو نہیں مانتا، میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے اور کھاتے تو کیوں کر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی، سامان منگوانا ہوتا، لکڑی کا خرچ، تیل کا خرچ، نون کا خرچ، غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے، چائے بنائی، پی لی۔ ادھر ادھر گئے، پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے، بان کی کھرّی چارپائی پر لوٹ ماری، چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہو کر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس بھی ہو سونے میں بڑا آرام دے گی۔

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ان کے یار دوست، شاگرد غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے، کچھ رکھ چھوڑتے۔ مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے، ان کو پونچھ پانچھ، صاف کر جمع کرتے جاتے، انھی کاغذوں پر خط لکھتے، غزلیں لکھتے، غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا بس انہیں کاغذوں پر ہوتا، خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیوں کر تھے۔

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں، مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے ان کی رائے معلوم ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوج داری ہو جائے۔

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے الفاظ دماغ سے اتارتے کہ باید و شاید۔ جہاں ثبوت طلب کیا اور انھوں نے شعر پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے یہ خود ان کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اس شاعر کا۔ بھلا ایک لفظ کے لیے کون دیوان ڈھونڈنے بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہ ہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں، ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے، اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کے آئے تھے کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ انھیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام میں لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا، اس وقت سب کی یہ رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحیدالدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور اب ان کے بعد ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا، ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی، مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو، ان کے لیے۔ خوب سمجھتے تھے اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو

نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔

مولوی صاحب کیا مرے، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا، اس حصے میں اڑ واڑ بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لیے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعُقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اُس سرے تک، ہندوستان چھان مارو، مولوی وحیدالدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے، ان کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(مضامینِ فرحت)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل جملوں کی تشریح کیجیے:

i- مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا، مرنے کے بعد بھی ان کا نام زندہ کر دیا۔

ii- جتنی ان کی نگاہ وسیع ہوئی اتنا ہی ان کا دل تنگ ہوا۔

iii- مولوی صاحب کو ملنے سے فرصت نہ تھی اور مجھے ملنے کی فرصت نہ تھی۔

iv- ادھر ریل چلی اُدھر اُن کی زبان چلی۔

v- سرسید کی خدمت میں سر گاڑی اور پاؤں پہیہ کیا۔

۲۔ اس سبق سے مزاح کی کچھ مثالیں تحریر کیجیے۔

۳۔ مندرجہ ذیل کے معنی لکھیے:

رکاکت، فوجداری، مباحث، منڈوا۔

۴۔ مولوی وحیدالدین سلیم اصطلاح سازی میں کس زبان کے اُصولوں سے مدد لیتے تھے؟

۵۔ فرحت نے مولوی صاحب کی کون سی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے؟

۶۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے اندازِ نگارش پر نوٹ لکھیے۔

۷۔ مصنف نے مولوی وحیدالدین سلیم کی وضع قطع کا جو نقشہ کھینچا ہے، اسے اپنے الفاظ میں لکھیے۔

۸۔ کیا مصنف نے مولوی وحیدالدین سلیم کے مزاج اور کردار کے کمزور پہلوؤں کو چُھپانے کی کوشش کی ہے؟ اگر نہیں تو انھیں کس انداز میں پیش کیا ہے۔

۹۔ سبق سے مرکباتِ توصیفی تلاش کر کے لکھیں۔

۱۰۔ درج ذیل کی وضاحت کیجیے۔

اڑواڑ، صراحت، بے نقط سنانا، طبعِ رسا، رکاکت، یورش کرنا

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ولادت:۱۸۹۶ء وفات:۱۹۷۷ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی ضلع جون پور میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول جون پور سے پاس کیا اور ایک سرکاری دفتر میں کلرک ہو گئے۔۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔علی گڑھ ہی سے ۱۹۲۱ء میں ایم۔اے کیا اور وہیں پر ۱۹۲۲ء میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔۱۹۵۴ء میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوئے۔انھوں نے علی گڑھ ہی میں رہائش اختیار رکھی۔۱۵۔جون ۱۹۷۷ء کا اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

رشید احمد صدیقی طنز و مزاح میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔انھوں نے مزاح نگاری میں ایک نئے انداز کی طرح ڈالی۔ان سے پہلے طنزیہ مضامین میں اتنی رعنائی اور شگفتگی نظر نہیں آتی۔وہ غالب کے شعروں کو جا بجا اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ان کا مزاح ادبی ہے۔وہ الفاظ و واقعات سے بھی نہایت عمدگی سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔وسیع النظری، ادراک و مشاہدے کی قوت اور وسیع مطالعہ ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بارے میں اتنی وسیع معلومات اور فلسفیانہ نکات کا مہیا کر دینا انھی کا خاصا ہے۔ان کو علی گڑھ کے ماحول اور مخصوص فضا سے محبت ہے جسے انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔

مزاح نگاری میں رشید احمد صدیقی نے ایک نئے انداز کی طرح ڈالی۔اس سے پہلے طنزیہ مضامین میں اتنی مقصدیت' رعنائی' توانائی اور شگفتگی نظر نہیں آتی اور طنز و ظرافت کی سطح اتنی بلند نہیں ہے جتنی رشید احمد صدیقی کے یہاں ملتی ہے۔یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں اور پڑھنے والا گدگدی محسوس کرتا ہے۔ان کا مخصوص اسلوب ان کے شخصی خاکوں میں بھی اپنی بہار دکھاتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کی تصانیف میں ''طنزیات و مضحکات''، ''مضامین رشید''، ''گنج ہائے گراں مایہ''، ''خنداں''، ''ہم نفسانِ رفتہ''، ''غالب کی شخصیت اور شاعری'' اور ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' شامل ہیں۔''گنج ہائے گراں مایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

احسنؔ مارہروی

مولانا سید علی احسن صاحب احسنؔ مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبے کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزّت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقے میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارے میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے۔

ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آ گیا جس کی صحت یا محلِ استعمال پر اختلاف آ رہا ہوا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے۔ اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب برآری نہ ہوتی تو بلا کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری میں چلے گئے، وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہوگئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتاتے۔

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور تمام تر احسن مرحوم ہی کے سپرد کیے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے' کہتے تھے: ''استاد داغؔ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقے میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارے میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پورا کرتے۔ اس سے داغؔ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔'' چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکے کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں لکھتے کہ مولانا مرحوم ہی کا فیصلہ قولِ فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محبت سے جمع کرتے۔ کہتے تھے: ''دو چوریاں جائز ہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی''۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں' نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے ان میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں' لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام۔ کہتے تھے: ''زبان کی غلطی کیسے سن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔'' مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارے میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔

مولانا جیسا قادرالکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گزرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلیٰ حضرت خسرو دکن کے خرد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحۂ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسؔن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرائے میں قلمبند کرنا شروع کیا۔ عالم یہ تھا کہ شعبۂ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں' ہر طرح کے طلبہ اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے' علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں' ہنسی مذاق میں شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہوگئی۔ مولانا کی مشکلات[1] اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکارِ عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے' پیشِ نظر ہوں۔

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغؔر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرع طرح دے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہوگئے۔ آواز میں لکنت تھی۔ اس لیے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا۔ ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتا پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین چڑھا لی اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ ''میاں ہوش میں آؤ کہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں۔ اصغؔر کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پر پڑیں تابڑ توڑ جوتے اور اُس وقت مصرع طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے''۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبہ شوخیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلّم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھتے تھے۔ وہ بات اس زمانے میں کہاں! ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبہ بھی آگئے۔ معلوم ہوا کہ بعض طلبہ کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔ معاملہ رفت گذشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلے پر مولانا سے گفتگو ہوئی۔ فرمایا: رشید صاحب! طلبہ پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گزاری اور تفریح و تفنن کے لیے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں! میں نے عرض کیا: مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے۔ لیکن کیا کیجیے گا۔ یہ طلبہ کا قصور نہیں ہے۔ دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانے میں قدر و قیمت رکھتی تھیں وہ اب مردود ہو چکی ہیں۔ حفظِ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیے نہیں۔ لڑکوں کو معاف کر دیجیے ان کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مرحوم کو اطمینان نہیں ہوا۔ بولے: جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس[2] دیجیے۔ مولانا کی اس برہمی سے لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا: مولانا فرض کیجیے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجیے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجیے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی کی فکر کیوں نہیں کرتے ہیں؟ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں اِنّاللّٰہ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

۱۔ شاعرانہ وقت پسندی ۲۔ مولانا احسن مارہروی صاحب لفظ کلاس کو مذکر مانتے تھے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے تھے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پروانہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کاربنکل[1] سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جاملایا۔

مرحوم مقررہ میعادِ عمر ختم کر کے ملازمت سے سبک دوش ہوئے تھے لیکن اس سن وسال کے باوجود اتنا کام کیا کرتے تھے جوان سے بہت کم عمر والوں کے لیے مشکل تھا۔ ان کے قوائے ذہنی وجسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی وزندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا' خُردوں میں خُرد' بزرگوں میں بزرگ' کیسے کیسے زمانے' کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھتے اور برتتے ہوئے یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰۔ اگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوشِ رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا' مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی مولانا احسن کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے: اور کیوں حضور! سنتا ہوں ''خنداں'' شائع ہو گئی؟ میرا نسخہ کہاں ہے؟ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لیے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجیے' پڑھ کر واپس کردوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب' کہاں ایک معمولی کتاب کی طلب' اللہ اکبر! میں مبہوت ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان وزمین کی ساری پنہائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہو گئی۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے: رشید صاحب! خدارا کتاب بھیج دیجیے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

(گنج ہائے گراں مایہ)

۱۔ کاربنکل (Carbuncle) ذیابیطس کی بیماری جو پھوڑے جسم پر نکل آتے ہیں انھیں کاربنکل کہتے ہیں یہ اُس وقت تک ٹھیک نہیں ہوتے جب تک کہ جسم میں شوگر (Sugar) کی سطح کو اعتدال پر نہ لایا جائے۔

سوالات

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیجیے:

(i) پروفیسر رشید احمد صدیقی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ii) ''گنج ہائے گراں مایہ'' کس کی تصنیف ہے؟

(iii) طالب علمی کے زمانے میں آپ نے کس رسالے کی ادارت کی؟

2- پروفیسر رشید احمد صدیقی کے حالات زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

3- مزاح نگاری میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک نئی طرح ڈالی ہے۔ بحث کیجیے۔

4- معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت پروفیسر رشید احمد صدیقی الفاظ سے کھیلتے ہیں اور پڑھنے والا گدگدی محسوس کرتا ہے۔ ان کے شخصی خاکوں کو مدنظر رکھ کر بحث کیجیے۔

5- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) مولانا احسن مارہروی کالج میں کس شعبے سے تعلق رکھتے تھے؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) اردو (د) انگریزی

(ii) مولانا احسن کے نزدیک دو چوریاں جائز تھیں۔ ایک دل کی اور دوسری۔

(الف) سائیکل کی (ب) قلم (ج) کیمرے کی (د) کتاب کی

(iii) مولانا جیسا میری نظر سے کم گزرا ہے

(الف) لیڈر (ب) شاعر (ج) ادیب (د) مقرر

6- مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) باہر سے.......................استفسارات آتے رہتے۔

(ii) مولانا کو.......................سے عشق تھا۔

(iii) نصف پیالی شکر اور...........چائے۔

(iv) ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ...........ہوتا تھا۔

(v) کہاں مرض الموت کا یہ.......................کہاں ایک معمولی کتاب کی طلب۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کیجیے:

سلام و پیام، دم بخود، حفظِ مراتب، احتساب نفس، لطف اندوز

8- پروفیسر رشید احمد صدیقی کی سوانح نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

مضمون، انشائیہ

اہم خارجی خصوصیات کے اشتراک کی وجہ سے جن میں موضوع کی وسعت، ہیئت کی لچک، زبان وبیان کی ندرت اور اختصار شامل ہیں، مضمون اور انشائیہ کو اکثر ایک ہی صنفِ ادب کی دوصورتیں شمار کیا جاتا رہا ہے یعنی اردو میں انگریزی ایسے "Essay" کی صورت۔ لیکن ان کے داخلی اور موضوعی اختلافات کی وجہ جو دراصل گہرے اور بنیادی ہیں، اب ان میں واضح امتیاز کیا جانے لگا ہے۔ مضمون نگار کسی بھی موضوع پر مدلل، سنجیدہ اور منطقی ایسی معروضی تحریر ہے جس کا مقصد کسی حقیقت، خیال یا نقطہ نظر کو قاری تک پہنچانا ہے۔ زبان وبیان کی دلکشی اور اسلوب کی ندرت بھی اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جب کہ ''انشائیہ'' ایک داخلی، ذاتی اور شخصی ایسی موضوعی تحریر ہے جس کا اسلوب اور بیان کسی خارجی مقصد کا تابع نہیں بلکہ لکھنے والے کی شخصیت، اس کے زندگی کے مجموعی تصور اور انفرادی احساس کا اظہار ہے۔ مضمون اور انشائیہ دونوں کے موضوعات لامحدود ہیں لیکن جہاں مضمون زیر بحث موضوع کو مکمل طور پر معروضی اور منطقی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے وہاں انشائیہ کی خصوصیت، داخلی انداز، رمز وایمائیت اور شخصی نقطہ نظر ہے۔

مضمون اور انشائیہ دونوں کے ابتدائی نمونے سرسید احمد خاں کے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً امید کی خوشی، خوشامد، بحث وتکرار وغیرہ۔ لیکن ان کی تحریریں انشائیہ سے زیادہ مضامین ہیں۔ سرسید کے بعد لکھنے والوں میں حالی، شبلی، شرر، سجاد حیدر یلدرم، شیخ عبدالقادر، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان ادیبوں نے بھی مضمون اور انشائیے میں کوئی واضح فرق کیے بغیر لکھا۔ جدید دور میں البتہ انشائیہ کو مضمون نگاری سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے اور انشائیہ نگاری ان دنوں بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی پہچان اور مقبولیت کے لیے بہت کام کیا ہے۔ انشائیہ لکھنے والوں میں مشکور حسین یاد، وزیر آغا کے نام اہم ہیں۔

مولانا محمد حُسین آزاد

ولادت: ۱۸۳۰ء وفات: ۱۹۱۰ء

محمد حسین آزاد اُردو ادب کے عظیم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ دتی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا جن کا یہ امتیاز ہے کہ وہ شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانیوں میں سے ہیں۔ آزاد نے دلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ شعروادب کا شوق بچپن سے تھا۔ استاد ابراہیم ذوق ان کے والد کے دوستوں میں سے تھے لہٰذا آزاد نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ان کے والد شہید کر دیے گئے۔ آزاد چھپ چھپا کر دتی سے نکلے اور آخر کار لاہور پہنچ گئے۔ یہاں مختلف ملازمتیں کیں اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہوگئے۔ آخر میں خلل دماغی میں مبتلا ہوئے اور زندگی کے آخری بیس سال اسی حالت میں بسر کیے لیکن اس حالت میں بھی تصنیف کا کام جاری رکھا۔

آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب، مورّخ، نقاد، ماہر لسانیات وفرہنگ، تمثیل نگار، مرقع نگار، تذکرہ نگار، شاعر اور استاد تھے۔ ان کی نثر اسلوب بیان کا ایک رنگیں اور دل فریب شاہکار ہے جس نے ان کے بعد آنے والے ادیبوں کے ایک وسیع گروہ کو متاثر کیا۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ اردو میں جدید طرزِ شاعری کا آغاز ہے جس کی ابتدا انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں سے ہوئی جس کے وہ سیکرٹری تھے۔ اسی انجمن کے جلسہ منعقدہ ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء میں انھوں نے اپنا ایک مضمون ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' پڑھا۔ یہ اردو ادب اور تنقید میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا جس میں شاعری کی ماہیت، نوعیت، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے درمیان تعلق اور فرق، شاعر کے کردار اور شاعر کی مقصود و غایت پر اظہارِ خیال کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں جو بنیادی مباحث اٹھائے گئے تھے وہ آج بھی ادبی تنقید کا اہم موضوع ہیں۔ یہی مضمون جو ان کے اسلوب بیان کا بھی اہم نمونہ ہے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

آزاد نے ساری عمر لکھنے میں بسر کی ان کی اہم کتابوں میں ''آبِ حیات''، ''سخن دان فارس''، ''دربار اکبری''، ''نیرنگِ خیال''، ''قصص الہند'' اور ''نظمِ آزاد'' مشہور ہیں۔

مولانا محمد حُسین آزاد

نظم اور کلام موزوں کے بارے میں خیالات

فلاسفہ یونان کا قول ہے کہ دنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اوّل نُطقِ انسانی کہ بے گویائی حال باطن کا بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انھیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزوں و مقفّیٰ لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہیے کہ وہ کلام موثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اس کا سننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو لیکن اثر سے خالی ہو تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزہ نہیں۔ کھٹا نہ میٹھا۔ جیسا کہ یہ شعر کسی استاد کا ہے:

ے دندانِ تُو جملہ در دہانند
چشمانِ تُو زیرِ ابرو اندل[1]

جب انسان کے دل میں قوت گویائی اور جوششِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اس قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا اسی قدر کلام پُر تاثیر ہوگا۔ روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدمؑ کے دل پر طاری ہوا۔ اسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اس وقت ان کی زبان سے نکلا موزوں تھا۔ چنانچہ وہ سریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ تو فرزند رشید وہی موزوں طبع ہے کہ جو باپ کی میراث سے بہرور ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوت انسانی بھی اسی میں کامل سمجھنی چاہیے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زور طبیعت سے نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون، کوئی مطلب، کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے تو تکلم سے نقشِ مدعا کو رنگِ تقریر میں لاتا ہے تا کہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصوّر ہے۔ لیکن نہ وہ مصور کہ خر و اشتر، درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصور ہے کہ معنیٰ کی تصویر صفحۂ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے عکسِ نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیا جن کی تصویر مصور سے نہ کھینچے زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے مگر صدہا سال سے آج تک ان کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویر غم صفحہ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامین فرحت و عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہائے مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔ اہل عرب معرکہ ہائے قتل میں رجز خوانی کرتے تھے۔ شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے؛ پتھر کو گویا کر دے؛ درختانِ پا در گل کو رواں کر دکھائے؛ ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے؛ دور کو نزدیک کر دے؛ زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیے کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہیں، ترازو اس کی، شاعر کے ہاتھ میں ہے؛ جدھر چاہے جھکا دے۔

نظم درحقیقت ایک شاخِ گل ریز، فصاحت کی ہے۔ جس طرح پھولوں کے رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بو سے مختلف خوشبویاں محسوسِ دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے کسی کی بو مست ہے۔ کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سہانا پن، اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے۔ جس طرح پھول کو کبھی چمن میں، کبھی ہار میں، کبھی عطر کھینچ کر، کبھی عرق میں جا کر، کبھی دور سے،

---

1 اے محبوب تیرے سارے دانت تیرے منہ کے اندر ہیں اور تیری آنکھیں تیرے ابروؤں کے نیچے ہیں۔

کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں۔

عالمِ جسمانی میں انسان کے لیے غذا مادہ حیات ہے۔ اس طرح عالمِ معنی میں روح کے لیے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار، مضامین لطیف سے روح قوت کمال اور طاقتِ بلند پروازی پاتی ہے، یہی اس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے کہ وہ خاص روح القدس کے آفتاب قدرت کا پرتو ہے۔ اسی سے شعر کے جوہر لطافت کو خیال کرنا چاہیے کہ نفاست میں کس مرتبہ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبت خاص عالم بالا سے ہے کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے ادھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتو روح القدس کا اور فیضان رحمتِ الٰہی کا ہے کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہراً اپنے کلبہ احزان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح حکومت کرتا ہے جیسے کوئی صاحب خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے اور بہ تصرف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اس کی جسے ایسے مِلک معنی کی سلطنت نصیب ہو؛ شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے؛ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے؛ روشنی عبارت کا پرتو ہے؛ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر؛ تاثیرِ معنوی کا ست ہے۔ روح کے لیے آبِ حیات ہے۔ گرد غم کو دل سے دھوتا ہے؛ طبیعت کو بہلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی، اور ذہن کو قوت پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامن دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنیٰ ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردّد میں غرق رہتا ہے لیکن ایک شعر تر کہ جیسی اس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے، بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے اور وہ لطف طاقت تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔ اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے، صاحب درد ہی اسے خوب جانتا ہے کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونی طبع جوہرِ خداداد ہے اور اس نعمت کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

جنون بھی ایک طرح لازمہ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے، ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنوں کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔

اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جسمانی محنت سے مرکھپ کر انھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطفِ شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں، ایک مصرعِ پُر درد ان کی زبان سے نہ نکلے۔

بعضے ایسے ہیں کہ ان سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انھیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضبِ الٰہی ہے خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں۔ مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان ان کی صاف ہے مگر مضامین عالی نہیں۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوشِ مضامین اور شگفتگی طبع کے لیے بعض بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں بلکہ ناموزوں اور مردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکتِ مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اول خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے۔ خواہ گھر میں

گوشۂ عافیت ہو، خواہ باغ صحرا، خواہ کنارِ دریا اور دل ہمہ تن اسی میں مصروف ہو۔

اکثر وقتِ شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سنسان ہو جاتا ہے، تب اس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے، خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے اور مضمون بَر تا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظِ پُر معانی زبان سے متراوش ہوتے ہیں۔

اس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت یا غم، رزم یا بزم کا باندھتا ہے، جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے، اتنا ہی اثر سننے والوں کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں کہ جب وہ شعر سنتے ہیں تو دل بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کے دل مثل آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کے سامنے اگر طلسماتِ معنیٰ کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو تو بھی انھیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنیٰ اس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشن دلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع وغروبِ آفتاب اور انقلابِ صبح وشام ہزاروں باغ نو بہار قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہِ عالم ایک خراس یا گرداب ہے کہ دن رات چکر میں چلا جاتا ہے۔

علم موسیقی کا لطف اور گلزار بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بے چارے ان کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اس طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائی دل سے محروم ہیں وہ کیفیتِ شعر وفصاحتِ کلام سے محروم ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضی طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آ جائیں تو بے شک شعر بالکل کار بے فائدہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ وقصص میں صرف کریں تو فائدہ وکسبِ دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنیٰ اور اصلِ سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صناع خبثِ طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آ سکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی، پس اس کے لیے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائلِ اہلِ فلسفہ وحکمت جن سے اہل ہدایت ثبوتِ ذاتِ باری اور تصدیق وحدتِ الٰہی کرتے ہیں، اسی سے اہلِ ضلالت دہر والحاد پر استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے ان کی ضلالت سے فلسفہ وحکمت پر الزام نہیں آ سکتا۔ اسی طرح شاعروں کی بدزبانی وبدخیالی سے شعر بھی تہمت کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش وخروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں جوں بلند ہوتے ہیں مرتبہ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متجر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین وآسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت وبلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین وحکامِ عصر کی قباحت ہے۔ انھوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی کی، لوگ اس میں ترقی کرتے گئے۔ ورنہ اسی نظمِ شعر میں شعرائے اہلِ کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی

ہیں جن کی بنا فقط پند و اَندرُز پر ہے اور ان سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم سنائی و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی، فنِ شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرہ نیک حاصل ہو۔ آزاد:

تمھاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

(مقدمہِ نظمِ آزاد)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(i) اردو میں جدید طرز کی شاعری کا آغاز کس نے کیا؟ (ii) ''آب حیات'' کس کی تصنیف ہے؟

(iii) فلاسفہ یونان کے مطابق کون سی دو چیزیں نہایت موزوں ہیں؟

۲۔ مولانا محمد حسین آزاد کے حالات زندگی اختصار سے بیان کیجیے۔

۳۔ محمد حسین آزاد نے شاعری اور دوسرے فنون میں کچھ مشترک اور کچھ اختلافی خصوصیات کا ذکر کیا ہے مضمون کی روشنی میں وضاحت کیجیے۔

۴۔ ''شاعری محض کلام موزوں کا نام نہیں ہے'' بحث کیجیے۔

۵۔ درست جواب کے شروع میں ''✓'' کا نشان لگایئے:

(i) شعر کے معنی ہیں

(الف) کلام پُر تاثیر (ب) کلامِ موزوں (ج) کلام موزوں وپُر تاثیر (د) کلام شیریں

(ii) نظم درحقیقت ایک شاخ گل ریز ہے

(الف) فصاحت کی (ب) بلاغت کی (ج) جذبات کی (د) احساسات کی

(iii) جنون بھی ایک طرح ہے

(الف) لازمۂ زندگی (ب) لازمۂ شاعری (ج) لازمۂ موسیقی (د) لازمۂ عمر

۶۔ مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) عالمِ جسمانی میں انسان کے لیے غذا............... ہے۔

(ii) جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے تب............... اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔

(iii) جس قدر قوتِ انسانی کا جوش وخروش زیادہ ہوگا اسی قدر کلام............... ہوگا۔

۷۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کیجیے۔

(i) کلامِ موزوں (ii) قوتِ گویائی (iii) فرزندِ رشید (iv) رنگینیِ فصاحت (v) تصویرِ غم

۸۔ شاعری کی ماہیت کے بارے میں آزاد نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اُس پر تنقیدی نگاہ ڈالیے۔

مہدی افادی

ولادت: ۱۸۷۷ء	وفات: ۱۹۲۱ء

آپ کا اصلی نام مہدی حسن تھا۔ دنیائے ادب میں مہدی افادی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق گورکھ پور کے ایک شریف اور معزز خاندان سے تھا۔ ان کے والد شیخ حاجی علی حسن کورٹ انسپکٹر تھے۔ مکتب کی تعلیم کے بعد گھر ہی پر عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں انگریزی تعلیم کے لیے سکول میں داخل کیے گئے۔ تعلیم کے سلسلے میں کچھ مدت علی گڑھ میں بھی رہے۔ ملازمت کا آغاز معمولی عہدے سے کیا بعد میں نائب تحصیل دار اور پھر تحصیل دار رہے۔ ۲۱۔ نومبر ۱۹۲۱ء کو لکھنو میں وفات پائی۔

مہدی افادی نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ خوراک، لباس اور گھر سب میں عمدگی اور خوب صورتی پسند کرتے تھے۔ ان کی تحریر بھی اسی نفاست اور شائستگی کی حامل ہے۔ وہ آزاد کی طرح تمثیلوں سے کام لیتے ہیں اور بے جان چیزوں کو متشخص کر دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں کہانی کہنے کا انداز ملتا ہے، جس کی وجہ سے اختصار کے بجائے پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی نثر میں ایسی تمثیلوں اور تشبیہوں کا استعمال کرتے ہیں جن کا تعلق جنس لطیف سے ہے۔ اس سے ان کی نثر میں ایک خاص طرح کی غزلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عربی و فارسی کی تراکیب ان کی نثر میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ انگریزی تراکیب کو اردو میں ڈھالنے کا کام بھی بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔ نئی تراکیب کے وضع کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔

مہدی افادی اردو ادب کے ان ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے دلکش اسلوبِ بیان اور جمالیاتی نقطۂ نظر کے باعث شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ وہ اردو میں رومانوی تحریک کے اہم محرکین میں سے تھے۔ ان کے مضامین نے اس مخصوص طرزِ تحریر کو فروغ دیا جس کا آغاز سجاد حیدر یلدرم کی تحریروں سے ہوا تھا اور جسے "ادبِ لطیف" کا نام دیا گیا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" کے نام سے ان کی موت کے بعد ان کی بیوہ نے مرتب کر کے شائع کیا۔ مہدی افادی کے خطوط بھی کتابی شکل میں شایع ہو چکے ہیں۔

سُقراط

سقراط، یونان کے مشہور اور نامور حکماء سے تھا، ایتھنس[1] میں پیدا ہوا۔ یہ شہر کسی وقت میں یونان کا دارالسلطنت تھا، اس میں یونیورسٹی بھی تھی۔ سقراط کا باپ ایک بت تراش تھا' آبائی پیشے کی رعایت سے اس وحیدِ عصر نے بھی سنگ تراشی میں مشق بہم پہنچائی مگر آخر اسے فلسفے کی تحصیل کا شوق ہوا۔ چونکہ طبیعت میں قدرتی طور پر اعلیٰ درجے کی صلاحیت موجود تھی' اس نے نہایت تیزی کے ساتھ فلسفے کا اثر قبول کیا۔

اوائلِ عمر میں باقتضائے آئینِ ملکی اسے فوج میں داخل ہونا پڑا۔ کئی لڑائیوں میں اس نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ ذنوفن اور ایلسی بایڈیز سے لائق شخصوں کی جان اسی نے بچائی۔ اسی وجہ سے ان دونوں کو بھی اس کے ساتھ بہت محبت تھی۔ ذنوفن فوج کا ایک سردار ہونے کے سوا صاحبِ تصنیف بھی تھا' اس کی تصنیفات خاص پائے کی ہیں۔ ایلسی بایڈیز ایک امیر کا بیٹا تھا' ہر قسم کے اوصاف اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے' حسنِ صورت کے ساتھ اعلیٰ حسنِ سیرت سونے پر سہاگے کا رتبہ رکھتا تھا۔

لڑائی سے فراغت کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی۔ کھانے کپڑے میں سادگی برتی، فلسفیانہ تحریریں شایع کیں، ہم وطنوں کو پابندیٔ مذہب کی تاکید کی۔ رفتہ رفتہ حکیموں کی ایک کثیر جماعت اس کے خیالات سے فائدہ اٹھانے لگی، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہوا، مختلف باغوں اور دریا کے کنارے پر یہ اپنے شاگردوں کو حکمت و فلسفہ کے نازک مسئلے سمجھایا کرتا۔ یہ طبیعت کا بہت آزاد تھا، اور انتہا درجے کا خوش تقریر بھی۔ اس کی فلسفیانہ نکتہ سنجیاں آخر میں اس کے ہم وطنوں کے لیے رشک و حسد کا باعث ہوئیں۔ ایک شاعر نے اس کی ہجو لکھی، جس کا منشا یہ تھا کہ سقراط نوجوانانِ ایتھنس کے اخلاق کو خراب کرتا ہے اور لڑکوں کو سکھلاتا ہے کہ اپنے والدین کی اطاعت سے انحراف کریں۔ عدالت نے اسی بنا پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا۔ تحقیقات کی گئیں۔ نتیجہ اس کو صاف گردن زدنی ثابت کرتا تھا۔ یہ حراست میں لے لیا گیا۔ اس کے احباب نے رہائی کی بہتیری صورتیں نکالیں۔ خود داروغہ جیل اس کے بھاگ جانے پر راضی ہوا' مگر سقراط کو جس وقت اس ارادے کی خبر دی گئی' اس نے اختلاف کیا' اور نہایت استقلال سے یہ بات کی کہ "میں موت سے بھاگنا نہیں چاہتا"' جیل میں اسے زہر کا پیالہ دیا گیا۔ اس نے بے تکلف اپنے ہونٹوں سے لگالیا اور اپنی جان دے دی۔

سقراط کے خونِ ناحق سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی اور اس کے دشمنوں کو نہایت ذلت کے ساتھ اپنی نالائقی کے خمیازے کھینچنے پڑے۔ سقراط کی سوانح عمری ذنوفن اور افلاطون نامی اس کے شاگردوں نے لکھی ہے' ان دونوں نے اس کے اقوال کی علیحدہ علیحدہ ترتیب دی ہے جو واقعی دیکھنے کے لائق ہے۔

سقراط نے شادی بھی کی تھی' اس کی بیوی بہت ہی بدمزاج تھی' سقراط کے ساتھ اس کے برتاؤ سخت تھے لیکن وہ ہمیشہ اس سے نرمی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی بدمزاجی سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کی کچی پکی سنہ لینے سے یہ انتہا درجہ کی برداشت کا خوگر ہو گیا۔ ۴۶۸ برس پیشتر حضرت عیسیٰ کے پیدا ہوا اور ۳۹۹ برس قبل وفات پائی۔

سقراط کی رائے میں موجودہ وقت کو کسی آنے والے دن کی امید پر رائیگاں کر دینا بڑی غلطی ہے۔ وہ کسی چیز کا پس انداز کرنا اسی لیے ایک سرے سے فضول سمجھتا ہے۔ اکتسابِ علم کے لیے اس کے خیال میں کسی وقتِ خاص کی قید نہیں۔ عمر کا ہر حصہ انسان کی معلومات کو ترقی

۱۔ Athens

دے سکتا ہے۔ اس کی رائے میں کتب بینی ہی ایک عیش ہے جو ہر شخص کا اختیاری امر ہے۔ وہ ایک جاہل کو واجب الرحم سمجھتا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ اس شخص کی ہمدردی کرتا ہے، جس کا مربی کوئی بدتہذیب اور تاریک خیال کا آدمی ہو۔ وہ کہتا ہے عالی ظرف کی پہچان یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی معزز برتاؤ ہو۔ زیادہ سے زیادہ کوششیں اس کی یہیں تک محدود ہوں کہ دشمن کو تکلیف دینے سے محفوظ رہ سکے۔ غیبت کرنے والوں یا ایسے لوگوں کو جن کو دوسروں کی برائی میں دل چسپی ہوتی ہے، وہ شریف نہیں سمجھتا۔ ان کے ساتھ انتہائی رعایت یہ ہے کہ ان کو کمینہ کہا جائے۔ آخر میں وہ ہر شخص کو اپنی کانشنس[1] کی پیروی کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے زور دے کر یہ بات بتائی کہ صرف اصلیت پر نظر ہونی چاہیے۔ اس سے غرض نہیں، دوسرے کیا سمجھتے ہیں، وہ عام مقبولیت کی خواہش کو ایک طرح سے جنون سمجھتا ہے۔

ایک مقام پر اس نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات لکھی ہے: کہتا ہے کہ ''میں نہیں سمجھتا کیونکر لوگ عقل کی مخالفت کو جائز رکھتے ہیں، کسی بات کی صحت پر ان کو یقین کامل ہوتا ہے، تاہم وہ اس پر کاربند نہیں ہوتے، شاید کوئی خارجی اثر وجہ مزاحمت ہو، مگر میں سمجھتا ہوں، ان کے ارادے ہی کا یہ نقص ہے۔ مجھے آج تک کوئی بات ایسی نہ ملی جس کی سچائی کا یقین ہو، اور نہ کر گزرا ہوں۔ لوگ کچھ ہی سمجھا کریں، مجھے ان کی مخالفت کی قطعی پروا نہیں، اس لیے میں ان کو داخل جمادات سمجھتا ہوں۔''

(افادات مہدی)

۱۔ Conscience، ضمیر

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(i) مہدی افادی کا اصل نام کیا تھا؟ (ii) آپ کا تعلق کس خاندان سے تھا؟

(iii) آپ کے مضامین کا مجموعہ کس نام سے شائع ہو چکا ہے؟

۲۔ مہدی افادی کے حالات زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ مہدی افادی کے اسلوبِ تحریر پر نوٹ لکھیے۔

۴۔ درست جواب کے شروع میں ''✓'' کا نشان لگایے:

(i) سقراط کا باپ تھا ایک

(الف) بت تراش (ب) تاجر (ج) فوجی (د) کاشتکار

(ii) اوائل عمر میں باقتضائے آئینِ ملکی سقراط کو جانا پڑا:

(الف) پولیس میں (ب) فوج میں (ج) محکمہ مالیات میں (د) محکمہ شہری دفاع میں

(iii) حاسدوں نے سقراط پر الزام لگایا کہ وہ ایتھنس کے نوجوانوں کو گمراہ کر رہا ہے کہ وہ اطاعت نہ کریں:

(الف) بزرگوں کی (ب) والدین کی (ج) حاکمِ وقت کی (د) ایتھنس کے آئین کی

۵۔ مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) سقراط............... کے مشہور اور نامور حکماء سے تھا۔

(ii) ایتھنس کسی وقت میں یونان کا............... تھا۔

(iii) سقراط میں کئی لڑائیوں میں کار............... کیے۔

(iv) لڑائی سے............... کے بعد سقراط نے اپنی پہلی وضع تبدیل کر دی۔

(v) سقراط کے خونِ............... سے اہلِ ایتھنس کو بعد میں سخت پشیمانی ہوئی۔

۶۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
وحید	نمایاں	
باقتضائے	عصر	
کارِ	فلسفہ	
حکمت و	حسد	
رشک و	آئینِ ملکی	

۷۔ سقراط کا کردار زندگی کے کس پہلو کی عکاسی کرتا ہے؟

نیاز فتح پوری

ولادت:۱۸۸۶ء **وفات:۱۹۶۶ء**

نیاز محمد خان نام تھا۔ فتح پور، یو۔ پی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ فتح پور، مدرسہ عالیہ رام پور اور دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پائی۔ پرائیویٹ طور پر ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ایک ترک سے ترکی سیکھی۔ مختلف روزناموں کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کا کارنامہ رسالہ ''نگار'' ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے اردو ادب میں رومانیت اور رومانوی تحریک کو فروغ دیا۔ معاشرت، تہذیب اور ادب میں تنگ نظری اور قدامت پرستی کے خلاف جدوجہد کی۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۶۲ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے کراچی میں وفات پائی۔

رومانوی تحریک کے زیر اثر نیاز فتح پوری کی تحریروں میں ماضی سے محبت اور فطرت کے حسین نظاروں میں پناہ ڈھونڈنے کی خواہش ملتی ہے۔ وہ پہلے انشاء پرداز ہیں جنھوں نے عورت کو یونانی دیویوں کا سا تقدس اور ماورائیت کا مقام بخشا۔ ان کے موضوع سے زیادہ اہم ان کا اسلوب ہے۔ وہ مذہب، سیاست، معاشرت، خواہ کسی موضوع پر بھی لکھ رہے ہوں ہمیشہ ایک انشاء پرداز کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں رومانوی ادیبوں کی سی مخصوص شعریت پائی جاتی ہے۔ نیاز کی قوتِ استدلال کا راز بڑی حد تک ان کی لطیف، شیریں اور اتار چڑھاؤ رکھنے والی نثر نگاری میں ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے سبب نوجوان طبقے میں زیادہ مقبول رہے کیونکہ ان کی تحریریں عقل اور دلائل کی کسوٹی پر پورا اترتی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو مرعوب کرنے اور دلائل سے لاجواب کرنے کا گر خوب جانتے ہیں۔ نیاز کے کچھ افسانوں میں تخیل پرستی اور ماورائیت جھلکتی ہے۔

نیاز فتح پوری کی شہرت بطور رومانوی افسانہ نگار، مدیر ''نگار''، وسیع النظری اور جدید تنقیدی اور معاشرتی نظریات کی وجہ سے ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''جمالستان'' اور ''نگارستان'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ایک ناولٹ ''شاعر کا انجام'' ہے جس نے شہرت حاصل کی۔ دیگر مشہور تصانیف میں ''شہاب کی سرگذشت''، ''عرضِ نغمہ'' (ترجمہ گیتا نجلی) اور ''انتقادیات'' (حصہ اوّل و دوم) شامل ہیں۔

مسلمانوں کا عسکری اخلاق

(۱)

اے سرزمین فلسطین کے مسافر! اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر کے لیے حطین کے پہاڑ اور اس کی مختصر آبادی (طبریہ) پر بھی ایک نگاہ ڈال لے، جو اس وقت خواہ کتنی ہی گمنام ہو، لیکن زمانہ ماضی میں غیر معمولی شہرت کی مالک تھی۔

طبریہ کی شہر پناہ جو کوہ آتش فشاں کے سیاہ پتھروں سے تیار کی گئی تھی، ہر چند ۱۸۳۷ء کے زلزلے میں تباہ ہو چکی ہے۔ لیکن ان مسماریوں اور بربادیوں میں، ہنوز اس کی زبردست قوت حرب و دفاع کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔

(۲)

۵۸۲ ہجری ہے اور ربیع الآخر کی دسویں تاریخ۔ اس ہموار سڑک پر جو شہر صور سے قلعہ عکہ کو جاتی ہے دو سوار جو عربی گھوڑوں پر سوار ہیں مختلف سمتوں سے آتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور بیک وقت دونوں کی زبان سے حیرت و مسرت کے الفاظ نکلتے ہیں۔

ایک ''اے عامر! میں تو تمھارے ہی پاس جا رہا تھا۔ ہمارا سردار کونٹ روڈ طبریہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا ہے اور مجھے بھی اس کے ساتھ جانا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تم سے آخری بار چل کر مل لوں۔ کس کو خبر ہے کہ زندہ رہوں یا نہیں۔''

دوسرا ''اے فلپ! میں بھی تم سے رخصت ہونے آ رہا ہوں کیونکہ سلطان صلاح الدین لشکر کشی کا حکم دے چکا ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہو۔''

اس گفتگو کے بعد دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے اترے اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر وہیں ایک چٹان پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

فلپ فرانسیسی نوجوان تھا اور کونٹ روڈ کی فوج سے تعلق تھا۔ یہ کونٹ صرف حروب صلیبیہ میں حصہ لینے کے لیے فرانس سے آیا تھا، اور مختلف جنگوں میں اپنی جرأت کا ثبوت دے چکا تھا۔

ایک دن کوہستان بلس میں جنگ جاری تھی کہ میدان حرب کے گوشے میں فلپ کو ایک مجروح شخص نظر آیا، جو زخموں سے چور چور تھا، اور پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ فلپ نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا، کہ یہ تو ایک مشہور عربی سردار ہے، جس کو فلپ بارہا دیکھ چکا تھا اور جس کی شجاعت کا لوہا فرانسیسی مانے ہوئے تھے۔

فلپ نے فوراً اس کو پانی پلایا اور اس کا سر اپنی ران پر رکھ کر زخموں کو دھونے لگا۔ جب عربی سردار کو کچھ سکون ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور صلیبی سپاہی کو اپنے سرہانے دیکھ کر بولا کہ ''اے نوجوان! مجھے جلدی ہلاک کر ڈال کیونکہ میرا جو فرض تھا وہ ادا کر چکا ہوں اور مجھے اب زندگی میں کوئی تمنا باقی نہیں۔'' فلپ نے جواب دیا کہ ''اے معزز سردار! کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ روڈ میر کے کسی سپاہی نے مجروح و بے دست و پا دشمن پر حملہ کیا ہو۔ اے عامر! اے قبیلے کے سردار! میں میدان جنگ میں تم کو اور تمھاری شجاعت کو بارہا دیکھ چکا ہوں اور اس

لیے مجھ سے زیادہ بزدل کون ہوسکتا ہے اگر میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں؟''

یہ جنگ ختم ہوگئی اور نتیجہ مسلمانوں کے خلاف نکلا۔ لیکن فلپ پھر واپس نہیں گیا اور عامر کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کے علاج میں مصروف ہوگیا۔ یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہوگیا۔ اس کے بعد وہ دونوں جبل لبنان کی طرف چلے گئے اور عرصے تک خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ درآں حالیکہ صلیبی جنگیں برابر جاری تھیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں میں ہنگامہ حرب وقتال بدستور قائم رہا۔

ایک دن عامر نے اپنے دوست فلپ سے کہا کہ اگر آپ کی رائے ہو تو میں وادی تیم جا کر اپنے اعزا واقربا کو دیکھ آؤں۔

فلپ نے جواب دیا کہ ''میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جا کر اپنے عزیزوں سے مل آؤں۔'' چنانچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر اپنی اپنی منزل مقصود پر روانہ ہوگئے۔

جب عامر وادی تیم میں پہنچا تو اس کی قوم کے لوگ خوش ہوئے کیونکہ وہ اس کو مردہ تصور کر چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان صلاح الدین فوجیں جمع کر کے خود مسلمانوں کی کمک کے لیے پہنچنا چاہتا تھا۔

ادھر فلپ جب عکہ پہنچا تو وہاں بھی مسیحی فوجیں طبریہ پر حملے کی تیاریاں کر رہی تھیں اور اس طرح جب یہ دونوں پھر جنگ میں شرکت کرنے پر مجبور ہوگئے تو انھوں نے چاہا کہ ایک دوسرے سے مل لیں اور اس ارادے سے یہ دونوں اپنی اپنی جگہ سے چل کھڑے ہوئے اور راستے میں دونوں کی مڈ بھیڑ ہوگئی۔

(۳)

سلطان صلاح الدین جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور عزم کر چکا ہے کہ جس طرح ممکن ہوگا وہ صلیبیوں سے تمام اماکن مقدسہ کو پاک کر کے رہے گا۔ چنانچہ اس نے اعلان جہاد کر کے ہر چہار طرف سے مجاہدین کو جمع کرنا شروع کر دیا۔

کامل ایک سال گزر چکا ہے اور جنگ پوری قوت کے ساتھ جاری ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، وادیوں میں، قلعوں میں، قلعوں کے اندر و باہر عکہ سے یوروشلم تک اور بلس سے کَرَک تک ہر جگہ خون سے رنگین نظر آتی ہے۔

جب سلطان کو معلوم ہوا کہ مسیحیوں کی ایک فوج سمندر عبور کر کے آرہی ہے تو اس نے ایک لشکر زین الدین دارم کی قیادت میں حلب سے، دوسرا لشکر دمشق سے، تیسرا مظفرالدین کرکوکی کی قیادت میں اطراف صحرا سے طلب کر کے شہر طبریہ پر پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ اس طرح صلیبیوں کی طرف سے بھی مدافعت کی پوری تیاریاں تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے ساحل بحر تک پہنچنے سے پہلے ہی دونوں لشکروں کا تصادم ہوگیا۔ یہ دن سنیچر کا تھا اور ۵۸۱ ہجری کے ربیع الآخر کی ۲۵ تاریخ۔

(۴)

دونوں فریقوں کی جنگ کا اس وقت یہ انداز تھا جیسے شیر میدان میں لڑ رہے ہوں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک جانتا تھا کہ ارضِ مقدس کے قبضے کا فیصلہ اسی جنگ پر منحصر ہے۔ دونوں طرف سے سر کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ تیر پر تیر سینوں میں آکر پیوست ہو رہے تھے۔ لاشوں پر لاشیں گرتی جارہی تھیں اور خون نہروں کی طرح ہر چہار طرف بہہ رہا تھا آخر کار کئی گھنٹے تک یہ قیامت خیز ہنگامہ جاری رہنے کے بعد مسیحی

فوجوں نے گھونگٹ کھایا اوران کے پاؤں اکھڑ گئے اس جنگ میں پیادہ وسوار ۸۰ ہزار صلیبیوں نے شرکت کی تھی جس میں سوائے چند ہزار کے سب کام آگئے اور باقی نے پناہ طلب کرلی۔

(۵)

صلاح الدین: ''اے عامر! اس قیدی کو لے کر تو کیا کرے گا؟''

عامر: ''اے مولیٰ! آپ کو یاد ہوگا کہ میدان قتال میں آپ کے سامنے سے گزرا، اس حال میں کہ میری تلوار خون سے رنگین تھی، تو آپ نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد آپ میری ایک تمنا ضرور پوری کریں گے۔ چنانچہ اب میں وہی تمنا پیش کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ صلاح الدین نے آج تک عہد شکنی کبھی نہیں کی۔''

صلاح الدین: ''اے عامر! تو اس قیدی کی جان بخشی چاہتا ہے، جس نے میدان جنگ میں صلاح الدین کی گردن جدا کرنا چاہی تھی۔''

عامر: ''اے آقا! اگر یہ کوئی معمولی سپاہی ہوتا تو میں کچھ نہ کہتا۔ لیکن یہ شخص صلیبیوں کا بڑا مشہور جری سردار ہے اور ایک بار میری جان بچا چکا ہے، اس لیے میرا فرض ہے کہ آج میں اس کی جان بچاؤں۔''

سلطان صلاح الدین نے حکم دیا کہ قیدی لایا جائے۔ چنانچہ فلپ سامنے لایا گیا اور صلاح الدین نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''اے سردار! میں تیری جان بخشی کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تو میرے اس احسان کو کبھی فراموش نہ کرے گا۔''

فلپ نے کہا ''اے سلطان! میں جانتا ہوں کہ میری جان بخشی کا سبب عامر ہے اور اگر وہ میرا شفیع نہ ہوتا تو آپ ضرور مجھے قتل کر دیتے، اس لیے میرے شکریے کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف عامر۔''

صلاح الدین نے جواب دیا ''یہ تو نے صحیح کہا کہ میں یقیناً تجھے قتل کرا دیتا۔ لیکن اب تیرے جواب سے معلوم ہوا کہ واقعی تو شجاع انسان ہے اس لیے آ اور میرے اس ہاتھ سے ہاتھ ملا جو سوائے ایک شجاع انسان کے کسی اور کے لیے آج تک آگے نہیں بڑھا۔ میں نہ صرف جان بخشی کرتا ہوں بلکہ تجھے آزاد بھی کرتا ہوں۔ اے میرے عزیز جا اور ایک آزاد بھائی کی سی زندگی بسر کر۔''

چنانچہ عامر نے اپنے خاندان سے علیحدہ ہو کر اور فلپ نے اپنی قوم سے جدا ہو کر زہد و اتقا کے کامل تین سال ایک ساتھ عامرہ کے پہاڑ میں بسر کر دیے۔

حب زیتون کی بلندی پر ایک گھنا سایہ دار درخت ہے۔ جس کے نیچے دو قبریں نظر آتی ہیں جن میں سے ایک پر پتھر نصب ہے اور دوسری پر لکڑی کی صلیب۔ یہ قبریں عامر اور فلپ کی ہیں جنھوں نے مذہب کے نام پر تو ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھائی لیکن انسانیت کے نام پر دونوں نے مل کر ایک ساتھ ہی جان دی۔

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(i) نیاز فتح پوری کا سنِ پیدائش قلم بند کیجیے۔

(ii) تقسیم ہند کے بعد نیاز فتح پوری نے کون سا رسالہ جاری کیا؟

(iii) نیاز فتح پوری کی اہم تصانیف کے نام لکھیے۔

۲۔ نیاز فتح پوری کے حالات زندگی مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ نیاز کی قوتِ استدلال کا راز بڑی حد تک اُن کی لطیف، شیریں اور اتار چڑھاؤ رکھنے والی نثر نگاری میں ہے۔ بحث کیجیے۔

۴۔ درست جواب کے شروع میں "✓" کا نشان لگایئے۔

(i) طبریہ کی شہر پناہ زلزلے سے تباہ ہوگئی۔

(الف) ۱۸۳۵ء (ب) ۱۸۳۶ء

(ج) ۱۸۳۷ء (د) ۱۸۳۸ء

(ii) طبریہ کی بنیاد ہیرودیس نے ڈالی۔

(الف) دس سال قبل مسیح (ب) بارہ سال قبل مسیح

(ج) چودہ سال قبل مسیح (د) سولہ سال قبل مسیح

(iii) فلپ نوجوان تھا۔

(الف) فرانسیسی (ب) برطانوی

(ج) چینی (د) عرب

۵۔ مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) طبریہ کی .... کوہ آتش فشاں کے سیاہ پتھروں سے تیار کی گئی تھی۔

(ii) 637ء میں .... نے طبریہ کو حکومت اسلام میں شامل کر لیا۔

(iii) اے فلپ، میں بھی تجھ سے .... ہونے آ رہا ہوں۔

(iv) فلپ نے فوراً اس کو .... پلایا۔

(v) صلاح الدین ایوبی عزم کر چکا ہے کہ وہ صلیبیوں سے تمام .... مقدسہ کو پاک کر کے رہے گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

ولادت:۱۹۰۶ء وفات:۱۹۸۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ تحصیل مانسہرہ (اب ضلع) کے ایک گاؤں مَنگلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ عملی زندگی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی فہرست سازی سے کیا۔ بعدازاں یونیورسٹی ہی میں فارسی کے ریسرچ سکالر ہو گئے۔ جس کے بعد یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ عربی وفارسی واردو کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' کے عنوان سے مقالہ لکھا، جس پر ڈی لٹ (فارسی) کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی جگہ اورینٹل کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہو گئے اور بعد میں ریڈر، پروفیسر اور پھر پرنسپل بھی رہے۔ ان ذمہ داریوں سے فارغ ہونے کے بعد ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' کے صدر نشین کی حیثیت سے آخر عمر تک مصروف کار رہے۔

ڈاکٹر سید عبداللّٰہ ادبی تحقیق وتنقید کے اسی سلسلے کی کڑی ہیں جس کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد سے ہوا تھا اور جو حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ زندگی بھر علم وادب سے وابستہ رہے اور نہایت خاموشی لیکن استقامت کے ساتھ اردو زبان وادب کی ترقی اور خدمت میں لگے رہے۔

ان کا طرزِ تحریر سادہ، رواں اور سلیس ہے۔ ان کے نزدیک زبان، خیال کے ابلاغ اور ادراک کا ذریعہ ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ سادہ اور مناسب الفاظ میں اپنے مفہوم کو اس طرح بیان کریں کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ سکے۔ ادبی تنقید میں ان کے ہاں مغربی مطالعے اور حوالوں کے باوجود مشرقی نقطہ نظر غالب رہتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون ''الفاظ کی کہانی'' ان کے طرزِ تحریر اور فنی نقطہ نظر کی نمایاں مثال ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللّٰہ کی کتابوں میں ''نقدِ میر''، ''ولی سے اقبال تک''، ''وجہی سے عبدالحق تک''، ''سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کی نثر کا فنی وفکری جائزہ''، ''اشاراتِ تنقید''، ''مقاماتِ اقبال''، ''مباحث''، ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن''، ''کلچر کا مسئلہ''، ''بحث ونظر''، ''اطرافِ غالب''، ''سخن ور نئے اور پرانے''، ''ادب اور فن'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

الفاظ کی کہانی

الفاظ کیا ہیں؟ اشیا، اسما، حالتوں اور کیفیتوں کے آئینے ہیں۔ جب انسانی عمل ان میں ربط پیدا کرتا ہے تو یہ آئینے مل کر معانی کا ''چراغاں'' بن جاتے ہیں۔ زیادہ علمی زبان میں انہیں معانی کی علامتیں کہا جاسکتا ہے۔ ان علامتوں کی مدد سے انسان اظہار وابلاغ کرتا ہے۔

الفاظ کی کہانی انسانی ارتقا کی کہانی ہے...... الفاظ کی تاریخ ہر ملک میں اپنے سماجی ماحول کے تابع رہی ہے۔ اس ماحول میں الفاظ نے جنم لیا، نشو ونما پاکر جوان ہوئے، پھر پھلے پھولے اور حوادث وواقعات کے تحت لیل ونہار کا شکار ہو کر کبھی مضمحل و بیمار ہو گئے' کبھی بالکل مر گئے...... فقرے اور عبارتیں الفاظ کے طویل سلسلوں پر مشتمل ہوتی ہیں...... عبارتوں میں الفاظ ہی جان ڈالتے ہیں اور مختلف قسم کے جذبات وخیالات کی تصویر بن جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے الفاظ کی قیمتیں کئی انواع میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ قیمتیں جذبات وخیالات کے حوالے سے مقرر ہوتی ہیں اور اس بنیاد پر الفاظ کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں۔

بعض الفاظ جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں، ان میں قلبِ انسانی کی مختلف حالتوں کا عکس ہوتا ہے۔ بعض الفاظ تصویر دار ہوتے ہیں، یعنی ان میں خارجی کائنات کی تصویریں ہوتی ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کی قیمت ان کی آواز کی وجہ سے مقرر ہوتی ہے...... یہ گاتے بجاتے الفاظ جب عبارتوں کی صورت اختیار کرتے ہیں تو اس سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظِ چرب وشیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوتی قیمت رکھتے ہیں۔

مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت حاضر ہے۔ علم وحکمت کی زبان الفاظ کی ایک مستقل دنیا ہے جن کے مابین منطقی ربط ایک فکری خیال کو جنم دیتا ہے۔

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ الفاظ مرتے بھی ہیں اور مرتے تب ہیں جب ان کا استعمال ترک ہو جاتا ہے۔

الفاظ ایک زندہ سلسلہ ہے، لفظوں میں، ماحول اور زمان ومکان کے ساتھ تبدیلیاں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کے مختلف ادوار میں مختلف معنی نظر آتے ہیں۔

عربی کا لفظ عیش، ابتدا میں محض بمعنی زندگی استعمال ہوتا تھا۔ پھر جب عربوں پر خوش حالی کا دور آیا تو اس میں خوش حالی کا مفہوم شامل ہو گیا، یعنی عیش سے مراد خوش حالی کی زندگی ہوئی۔ رفتہ رفتہ خصوصاً فارسی، اردو تک پہنچتے پہنچتے لفظ عیش نہ صرف خوش حالی بلکہ پُر تکلف زندگی اور شوقِ فضول کا مترادف ٹھہرا۔ اب عیش کے ساتھ عشرت کا لفظ ملا لیا جاتا ہے اور یہ بے لگام مشاغل زندگی کا قائم مقام ہے۔

لفظ 'خان' کو دیکھیے۔ اس کا عروج وزوال بذاتِ خود عبرت کی کہانی ہے۔ خان کسی زمانے میں قبیلے کے رئیسِ اعظم یا سلطانِ وقت کا لقب ہوا کرتا تھا۔ چنگیز اپنے زمانے کا خان تھا، پھر اس کے شہزادوں نے یہ لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا جب بڑے بڑے عمائد وامرا کے لیے مخصوص ہوا۔ مگر بڑی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ اس کا رتبہ گرا، اس کا اطلاق ہر سرکاری عہدے دار پر ہونے لگا اور اب آخر میں ایک خاص قبیلے کے ہر فرد کے نام کا لاحقہ ہے، بلا امتیاز۔

لفظوں کے بیمار اور مضمحل ہونے کا قصہ اور بھی دلچسپ ہے۔ یہ بیماری دراصل بچارے لفظوں کی نہیں، ان کے بولنے والوں کی ہے۔

جب معاشرہ بگڑ جاتا ہے تو اس میں شریف اور بااخلاق الفاظ غلط یا بالکل الٹے معنوں میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ لفظوں میں منافقت پیدا ہوجاتی ہے وہ اظہار کا ذریعہ نہیں رہتے، اخفا کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اثبات حقیقت نہیں کرتے، اخفائے حقیقت کرنے لگتے ہیں۔

اہلِ مغرب جس زبان کو ''ڈپلومیسی''[1] کی زبان کہتے ہیں، اس میں لفظوں کے دو دو معنی ہوتے ہیں، ان سے بہت بڑا کام لیا جاتا ہے...... یہ وعدوں سے مکر جانے کی زبان ہے۔

مگر بعض اوقات لفظ بےچارے خود دھوکا کھا رہے ہوتے ہیں۔ بولنے والے شریف الفاظ کو دھوکا دیتے ہیں، اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور دل سے ان کو خود تسلیم نہیں کر رہے ہوتے۔ تہذیب، اخلاق، دین اور مذہب سے متعلق لفظوں کی یہ حالت ہوجاتی ہے کہ ان کا استعمال قلب کا ہم قدم نہیں ہو پاتا۔

بعض اوقات شریف الفاظ کی شرافت ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ سچائی، وفاداری، حیا، تواضع، حقیقت جیسے الفاظ سے ان کا اصلی سرمایۂ معنی ہی چھین لیا جاتا ہے۔ فرانس کے نیم رومانی، نیم مجہول ادب پر یہی گزر رہی ہے اور بعض اشترا کی معاشروں میں پرانی شریفانہ اقدار کو جاگیردارانہ اقدار کہ کران سے متعلق الفاظ کی حقیقت ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ خیر اور شر، نیکی اور بدی، صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی جیسے الفاظ کی کایا پلٹ ہوگئی ہے۔

سیاست اور اس کی امدادی سائنس نے جس طرح لفظوں کا خانہ خراب کیا ہے اس کا حال قابلِ گریہ ہے......اور اس کے ردِ عمل کے طور پر بیمار فلسفوں نے ہر شریف لفظ کو اتنے دھکے، مکے رسید کیے ہیں کہ اب یہ الفاظ نیم جان ہیں۔ فاشزم کی زبان ساری کی ساری بیمار زبان ہے کیونکہ اس کے الفاظ کی اخلاقی صحت بگڑ چکی ہے۔

علامتی ادب میں الفاظ بعض ذہنی، نفسیاتی اور روحانی کیفیتوں کا نشان بن جاتے ہیں.....لیکن یہ بھی بولنے والے، لکھنے والے پر منحصر ہے۔ وہ لکھنے والے جو خود روحانی طور پر بیمار ہوتے ہیں ان کی علامتیں اور علامتی الفاظ بھی بیمار ہوتے ہیں۔

جو لکھنے والے امید اور توانائی کا پیغام دیتے ہیں ان کی علامتیں، خوشگوار اور توانا الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں......ان میں رس اور قوت کے عناصر ہوتے ہیں۔ صوفیوں کی علامتوں میں وفورِ ثروت اور لاانتہائیت ہوتی ہے کیونکہ وہ اس ذات کی نشاندہی کرتے ہیں، جو کہیں افق کے پار ہے۔

غرض الفاظ کی دنیا عجائبات کی دنیا ہے...... رنگا رنگ، خوش آہنگ، نرم و نازک، توانا اور طاقتور...... کمزور اور صحت مند، شریف اور منافق...... عہد کے پکے اور عہد کے بودے، مستقل اور خانہ بدوش......، داستان در داستان...... ایک ایک لفظ کو لیجیے، صدیوں کی کہانیاں بیان کرتا جائے گا۔

ادھر شعرا اور حکما کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو لفظوں سے مطمئن نہیں۔ انہیں ناکافی اور نارسا مانتا ہے اور خاموشی کو گویائی پر ترجیح دے رہا ہے۔ چنانچہ نظیریؔ نے کہا:

ع خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید[2]

اور معاصر شاعر حقی[3] نے تو یہاں تک کہ دیا:

حرف رسوا ہوئے صدا بن کر
آبرو رہ گئی اشاروں کی

(ادب و فن)

۱۔ Diplomacy، سفارت کاری ۲۔ خاموشی (بعض اوقات) وہ معنی رکھتی ہے جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ ۳۔ ڈاکٹر شان الحق حقی

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(i) ڈاکٹر سیّد عبداللہ مانسہرہ کے کس گاؤں میں پیدا ہوئے؟

(ii) آپ نے عملی زندگی کا آغاز کیسے کیا؟

(iii) اُس مقالے کا عنوان لکھیے جس پر آپ کو ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی۔

۲۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے اسلوبِ بیان کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ درست جواب کے شروع میں "✓" کا نشان لگائیں۔

(i) الفاظ کیا ہیں؟ اشیا، اسما، حالتوں اور کیفیتوں کے ہیں:

(الف) آئینے (ب) عکس

(ج) دیے (د) روشن چراغ

(ii) الفاظ کی کہانی، کہانی ہے:

(الف) علمی ترقی کی (ب) انسانی ارتقا کی

(ج) ادبی معراج کی (د) انسانی فضیلت کی

(iii) بعض الفاظ آئینہ داری کرتے ہیں:

(الف) انسانی ضروریات کی (ب) معاشرت کی

(ج) جذبات کی (د) ماحول کی

۵۔ مناسب الفاظ سے خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی .... حاضر ہے۔

(ii) الفاظ کی قیمتیں کئی .... میں بٹ جاتی ہیں۔

(ii) عبارتیں .... کے طویل سلسلوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔

۶۔ لفظوں کے بیمار اور مضمحل ہونے کا قصہ دلچسپ ہے، یہ بیماری دراصل بے چارے لفظوں کی نہیں ان کے بولنے والوں کی ہے، بحث کیجیے۔

خواجہ حسن نظامی

ولادت:۱۸۷۳ء وفات:۱۹۵۵ء

آپ کا نام قاسم علی تھا لیکن حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔۱۸۷۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔والد کا نام سیّد عاشق علی تھا۔ان کے خاندان والے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے مجاور تھے۔بارہ سال کے تھے کہ والدین کا انتقال ہوگیا۔عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔خواجہ صاحب نے اپنی زندگی مذہبی اور ادبی کاموں میں گزاری۔ ان کے مرید ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ممالک اسلامیہ کا دورہ بھی کیا۔وہ کتابوں اور دہلی کی عمارات کے نقشوں کی تجارت کرتے تھے۔بچپن ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔وہ مختلف اخباروں میں لکھتے رہے۔خود بھی اخبار اور رسالے نکالے۔رسالوں میں اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر ان کے جو مضامین چھپتے تھے، وہ ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

خواجہ صاحب کا اندازِ بیان سادہ اور دل کش تھا۔فقرے چھوٹے چھوٹے مگر دل پذیر ہوتے تھے۔ان کے اسلوب میں سنجیدگی موجود رہتی ہے مگر سنجیدگی لطافت کا دامن تھام کر چلتی ہے۔وہ طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔انھوں نے عام اور معمولی چیزوں پر انشائیے لکھے ہیں، جس سے پتا چلتا ہے کہ انشاپرداز کے لیے دنیا کی کوئی چیز بھی بے کار اور معمولی نہیں ہوتی۔''برف''، ''لالٹین''، ''دیا سلائی'' اور ''جھینگر کا جنازہ'' پر ان کے انشائیے اس کی مثالیں ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کی کچھ اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

''مفلسی کا مجرب علاج''، ''سفرِ بمبئی کا روزنامچہ''، ''مجموعہ مضامین حسن نظامی''، ''سی پارہ دل (مضامین)''، ''ہمارے رسولؐ کی عادتیں''، ''غدر دہلی کے افسانے''، ''میلاد نامہ''، ''مجموعہ خطوط حسن نظامی''، ''رہنمائے سیر دہلی''، ''جگ بیتی''، ''فلسفہ شہادت''، ''توپ خانہ''، ''جرمن شہزادے کی لاش''۔

جھینگر کا جنازہ

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ افوہ! جب اس کی لمبی لمبی مونچھوں کا خیال کرتا ہوں جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا، تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم[1] کی نقل اتارتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا اگر دل سے یہ عہد نہ کیا ہوتا کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں، میں ان کو چار چاند لگا کر چھوڑوں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربیؒ[2] کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا: کیوں اے شریر! تو یہاں کیوں آیا؟ اچھل کر بولا: ذرا اس کا مطالعہ کرتا تھا۔ سبحان اللہ! تم کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی! یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا: واہ! قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں، مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں اور نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں، جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینی جانتا ہے تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی طاقت سے ایک نئی شان پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔ یہ جتنی یونیورسٹیاں ہیں، سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آ گیا اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ واہ! خفا ہو گئے؟ بگڑ گئے؟ لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ لیاقت تو یہ تھی کہ کچھ جواب دیتے، لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے، ہائے! کل تک تو یہ تماشا دیکھا تھا۔ آج غسل خانے میں وضو کرنے گیا تو دیکھا، بچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی تھی اور اس کو دیوار پر کھینچے لئے چلی جاتی تھیں۔

بے چارہ غریب تھا، خلوت نشیں تھا، خلقت میں حقیر و ذلیل تھا، مکروہ تھا، غلیظ سمجھا جاتا تھا، اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑ پتی راک فیلر کے شریک ماتم ہو گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں: خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں، کسی سوراخ میں، بوریے کے نیچے، آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔ نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن، نہ کوّے کی سی شریر چونچ تھی، نہ بلبل کی مانند پھول کی عشق بازی، شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے واسطے جلوۂ طور ہے۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدانِ جنگ میں ہے، ورنہ اس کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلا لیتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔

ہاں تو جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔ چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار، فاقہ مست کو بچاتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو ایک بلائے بے درماں ہے۔ اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔ خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہوتا ہوں:

ا۔ جرمنی کا بادشاہ جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ ۲۔ محی الدین ابن عربیؒ، عربی کے مشہور فلسفی عالم اور صوفی تھے۔

ع
جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا یہ پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر! اے فلاسفر! اے متوکل درویش! اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال! ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیشن پاس کرتے ہیں۔ خیر! اب تو شکمِ مور کی قبر میں دفن ہو جا مگر ہم ہمیشہ ریزولیشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

(سی پارۂ دل)

سوالات

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔
(i) خواجہ حسن نظامی کہاں پیدا ہوئے؟ (ii) خواجہ حسن نظامی کس عظیم درگاہ کے سجادہ نشین تھے؟
(iii) یہ مضمون کس کتاب سے لیا گیا ہے؟

۲۔ خواجہ حسن نظامی کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ خواجہ حسن نظامی نے جھینگر کو کن خصوصیات کا حامل قرار دیا ہے۔ مختصراً لکھیے۔

۴۔ خواجہ حسن نظامی کے اسلوبِ بیان کی خصوصیات قلم بند کیجیے۔

۵۔ ''انشائیہ'' کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ زیرِ نظر انشائیہ اس معیار پر کہاں تک پورا اترتا ہے؟

۶۔ درست جواب کے شروع میں ''✓'' کا نشان لگایے۔
(i) سب کتابوں کو چاٹ گیا' بڑا موذی تھا۔
(الف) جھینگر (ب) لال بیگ (ج) دیمک (د) کتابی کیڑا
(ii) جھینگر ابنِ عربیؒ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا تھا، اس کا نام تھا:
(الف) فصوص الحکم (ب) ذخائر الاخلاق (ج) فتوحات مکیہ (د) تفسیر القرآن
(iii) قرآن نے کتابیں پڑھ کر انھیں نہ سمجھنے والے کو کس جانور سے تشبیہ دی ہے؟
(الف) گدھا (ب) گھوڑا (ج) خچر (د) اونٹ

۷۔ مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کیجیے:
(i) خدا بخشے بہت سی .... کا جانور تھا۔ (ii) جھینگر کا .... ہے ذرا دھوم سے نکلے۔
(iii) حدیث میں آیا ہے۔ مرنے کے بعد .... کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔

۸۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے۔

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
نغمۂ ربانی	تُو یہاں کیوں آیا	
شکمِ مور کی قبر میں	راک فیلر	
خدا نے پردہ	گانے والے قوّال	
کیوں اے شریر	ڈھک لیا	
امریکہ کے کروڑ پتی	دفن ہو جا	

ڈاکٹر وزیر آغا

ولادت:۱۹۲۲ء وفات:۲۰۱۰ء

ڈاکٹر وزیر آغا ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد آغا وسعت علی خاں کاشت کاری کرتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم سرگودھا اور جھنگ میں حاصل کی اور اقتصادیات میں ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔۱۹۵۸ء میں ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔انھوں نے مشہور رسالے ''ادبی دنیا'' میں مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ شریک مدیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں اور ان کی وفات کے بعد ماہنامہ ''اوراق'' جاری کیا جو اب اردو کے عہد آفریں رسائل میں شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کو شاعری، تنقید اور انشائیہ نگاری پر دسترس حاصل ہے۔ان کے انشائیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔شاعری میں ان کی کتابیں ''شام اور سائے''، ''دن کا زرد پہاڑ'' اور ''غزلیں'' معروف ہو چکی ہیں۔تنقید میں انھوں نے ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تخلیقی عمل''، ''تنقید اور احتساب''، ''نئے مقالات''، ''تنقید اور مجلسی تنقید'' وغیرہ کتابیں لکھی ہیں۔اقبالیات میں ان کی کتاب ''تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں'' بہت مشہور ہے۔

اپنے انشائیوں میں ڈاکٹر وزیر آغا نے پاکستانی تہذیب کے نقوش اجاگر کیے ہیں۔ان کے انشائیوں میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کا انشائیہ ''بے ترتیبی'' اسی صنف ادب کی عمدہ نمائندگی کرتا ہے جو ان کے مجموعے ''خیال پارے'' سے لیا گیا ہے۔وزیر آغا کے تحریر کردہ انشائیے ''پگ ڈنڈی سے روڈ رولر تک'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

بے ترتیبی

میرے ملازم کی یہ ایک نہایت بری عادت ہے کہ جیسے ہی میں کہیں باہر جاتا ہوں وہ بے جھجک میرے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور آناً فاناً میرے پھیلائے ہوئے انتشار کو ترتیب اور سلجھاؤ میں بدل دیتا ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ بھلے آدمی! یہ کوئی قبرستان تو ہے نہیں کہ قبروں کی طرح میزیں' کرسیاں اور کتابیں بھی ایک خاص ترتیب میں قطار اندر قطار نظر آئیں۔ لیکن نہ جانے کیوں بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ وہ پہلے تو حیران ہو کر میری طرف دیکھتا ہے۔ پھر مسکراتا ہے۔ جب میں جواباً مسکرانے کی کوشش نہیں کرتا تو چپکے سے کھسک جاتا ہے۔ اگلی بار پھر وہی حرکت۔ سچ! میں تو تنگ آ گیا ہوں۔

آپ شاید کہیں کہ اگر ملازم حسب منشا نہیں تو اسے بدل دیجیے۔ بہت بہت شکریہ! بات دراصل یہ ہے کہ ملازم بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو قوم کی قوم ہی اس مرض میں مبتلا ہے۔ شاید چونکہ ان کی اپنی زندگی میں ترتیب اور توازن کا فقدان ہوتا ہے، اس لیے وہ آپ کے کمرے کو اپنی نارسا آرزوؤں کی تسکین کے لیے تختۂ مشق بناتے ہیں یا پھر ممکن ہے وہ مالکوں کی قوم سے انتقام لینے کے لیے ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہزاروں باتیں ہو سکتی ہیں۔ میرے ایک ''ماہر نفسیات'' دوست کا کہنا ہے کہ ملازمین کی یہ حرکت محض ایک ''خندہ استہزا'' ہے اور اس سے انھیں مالک کے مقابلے میں احساس برتری حاصل ہوتا ہے واللہ اعلم! نفسیاتی تحقیقات کے اس زمانے میں جو کچھ بھی ہو کم ہے۔

بہرحال' جیسا کہ میں نے کہا میں اپنے ملازم کی اس حرکت سے سخت پریشان ہوں۔ مجھے دراصل ترتیب سے وحشت ہوتی ہے۔ توازن اور سلجھاؤ سے میرا دم رکنے لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوں اور اپنے ہی عائد کیے ہوئے ضوابط میں اسیر۔ میرے لیے سخت ترین لمحہ وہ ہوتا ہے جب دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک سجا سجایا کمرہ میرا خیر مقدم کرتا ہے۔ ہر چیز قرینے سے دھری گویا صدیوں سے اسی طرح پڑی ہے' میزیں' کرسیاں' کتابیں' قالین اور پردے...... ہر چیز ایک غیر فانی ترتیب میں ڈوبی ہوئی کسی صوفیانہ استغراق میں گم' زمان و مکان کی سرحد کو عبور کر چکی ہے۔ مجھے کمرے میں آتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نے اگر کسی شے کو ہاتھ لگایا تو دفعتاً اس الف لیلوی ماحول کے کسی معطر پردے سے کوئی چمکتا ہوا خنجر برآمد ہو گا اور میرے سینے میں پیوست ہو جائے گا یا جیسے میرے داخل ہوتے ہی، پردہ غیب سے تحکم آمیز لہجے میں ''خبردار'' کا نعرہ بلند ہو گا اور میں پتھر کے بت میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ یہ ترتیب' یہ سلجھاؤ' یہ تغیر نا آشنا کیفیت' موت کے سے انجماد کا نقشہ پیش کرتی ہے اور میرے اپنے احساسات بھی پابہ زنجیر ہونے لگتے ہیں۔ میں خود بھی کمرے کا ایک حقیر سا بے روح جزو ہو کر رہ جاتا ہوں...... اس کے برعکس جب کمرے میں داخل ہوتے ہی دیکھتا ہوں کہ کرسیوں' میزوں' فرش اور آتش دان پر کتابیں' رسالے اور اخبارات آوارہ بچوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ ایک کرسی سربسجود ہے اور دوسری میز سے مصروف گفتگو۔ صوفے کا پردہ لٹک کر فرش کے قالین سے دست و گریبان ہے اور قالین کے شیر نوک پا کی زد میں ہیں...... آتش دان میں بجھے ہوئے کوئلے صحبت شب کے فراق میں مہر بہ لب ہیں اور سگریٹ کے ٹکڑے اور کیلے کے چھلکے میز کے حسن

میں اضافے کا موجب بن رہے ہیں......تو یکا یک محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک طویل مدت کے بعد اپنے کسی قریبی دوست سے ملا ہوں اور دوست نے دل کے دروازے کھول کر انتہائی خلوص اور محبت سے میرا خیر مقدم کیا ہے۔ بے ترتیبی میں محبت ہے، لچک ہے اور رفاقت۔ ترتیب میں تصنع، انجماد اور بے رخی ہے۔ بے ترتیبی سے شخصیت نمو پاتی ہے، پھلتی پھولتی، سبک اور تازہ دم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترتیب کی گراں بار کیفیت شخصیت کو منجمد کر دیتی ہے۔ محبت اور رفاقت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ پھیلنے اور بڑھنے کے امکانات کو ختم کر دیتی ہے۔ ترتیب کے دائرے میں داخل ہوتے ہی اشیا، کیفیات اور شخصیتیں اپنی مخصوص انفرادیت سے دست کش ہو جاتی ہیں اور ان کا سراپا اور وجود ایک مشین کی طرح کسی دوسرے کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ بے ترتیبی زندگی کی مظہر ہے۔ اس میں ایک بہاؤ، ایک رواں دواں کیفیت، گرم گرم لہو کی سی بے قراری اور ہر لحظہ تبدیل ہونے اور نئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت ہے لیکن ترتیب میں ایک سنگلاخی کیفیت ہے۔ ترتیب تو اس سوکھی شاخ کی طرح ہے جسے ذرا سا جھکائیں تو تڑاخ سے ٹوٹ جائے۔ اس میں نمی، لچک اور زندگی تو ہے نہیں۔

ترتیب میں ایک اور نقص یہ ہے کہ اس کے تحت آپ ضرورت سے زیادہ چاق و چوبند ہو جاتے ہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہزاروں بار دائیں بائیں آگے پیچھے نظر دوڑاتے ہیں۔ آپ کا ہر عمل بردباری، فراست، تہذیب اور توازن سے مملو ہو جاتا ہے اور آپ کی شخصیت کی باگ دوڑ خرد کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ یہ کوئی قابل مبارک باد بات نہیں۔ کیونکہ اس سے آپ کے آگے بڑھنے، ترقی پذیر ہونے اور پھلنے پھولنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ عقل کی تگ و دو تو ہمیشہ سے لب بام تک ہی رہی ہے۔ یہ آپ کو سبکسارانِ ساحل کی انجمن کا مستقل رکن بنا دیتی ہے اور زیادہ مہربان ہو تو اس انجمن کا اعزازی عہدہ بھی دے دیتی ہے اور آپ تالاب کے مکین کی طرح اپنی مختصر سی دنیا میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بے ترتیبی کا ہر عمل قید سے آزاد ہونے کا اقدام ہے۔ بے ترتیبی کی آوارہ خرامی ایک اجتہادی عمل ہے......ایک ایسا اجتہادی عمل، جس کے بغیر زندگی کا ارتقا ممکن ہی نہیں۔ ہزاروں باشعور، مہذب، مرنجاں مرنج، باترتیب انسانوں سے جو نہیں ہو سکتا وہ اکثر ایک آوارہ، جنونی، غیر مہذب انسان کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ ترتیب عقل و خرد کی غماز ہے۔ بے ترتیبی جذبے کی علم بردار ہے اور روسو کی تقلید میں میرا اپنا ووٹ جذبے کے حق میں ہے۔

بے ترتیبی میں ایک ملکوتی حسن ہے۔ ایک اچھلتے کودتے، ہنستے ناچتے اور شرارتیں کرتے ہوئے بچے میں جو کشش ہے وہ ایک متین، مہذب چبا چبا کر طوطے کی طرح رٹی رٹائی باتیں کرنے والے بچے میں کہاں؟ فطرت کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی میں ہے۔ سیدھے خط تو صرف انسان کھینچتا ہے اور بزعم خود سمجھتا ہے کہ اس نے کوئی بڑا تیر مار لیا ہے۔ انسان کے اُگائے ہوئے باغوں اور ترتیب دیئے ہوئے پارکوں کا سارا حسن قاعدے اور اصول کا رہین منت ہے لیکن فطرت کا حسن تو ان باتوں کا محتاج نہیں جو پاگل کر دینے والی خوبصورت، جو نشیلی کیفیت ایک خودرو جنگل میں ہے، ایک صاف ستھرے بنے ٹھنے ہوئے باغیچے میں کہاں؟ لیکن جنگل ترتیب کا محتاج نہیں۔ اس کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی میں ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے، دریاؤں کے پیچ و خم، سمندر کے کٹے پھٹے کنارے اور آسمان کے نیلگوں فرش پر بڑی بے پروائی سے بکھرے ہوئے ان گنت ستارے......کوئی چیز بھی تو ترتیب کے حصار میں قید نہیں۔ انسان کی ساری عمر اشیا کو ترتیب دینے میں بیت جاتی ہے اور ہر بار فطرت کی لازوال بے ترتیبی کا عمل بڑھ کر اس ترتیب کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیب خلاف فطرت عمل ہے۔ یہ محض انسان

کا ایک غیر صحت مند اقدام ہے...... تہذیب کی گرینڈ ٹرنک روڈ، سماج کی دائرہ در دائرہ تنظیم، نقطہ نظر کی سیدھی لکیر...... یہ سب انسان نے اپنی سوچ بچار سے جنم دیے ہیں۔ فطرت سے اخذ نہیں کیے۔ اسی لیے ان میں ایک دم روکنے والی کیفیت ہے جو احساس و جذبے کو شل کرتی اور فطری صلاحیتوں کو......

معاف کیجیے گا! میں اپنے ملازم کا ذکر کر رہا تھا۔ دیکھیے اس بار اس نے میرے باہر جانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور کمرے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے آدھمکا ہے۔ عجیب انسان ہے۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا ہے کہ بھلے آدمی......!

(خیال پارے)

سوالات

ا۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کیجیے:

(i) وزیر آغا کے انشائیوں کے پہلے مجموعے کا کیا نام ہے؟

(ii) مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مجلّے کا کیا نام ہے؟

(iii) وزیر آغا نے کون سا ادبی رسالہ جاری کیا؟

(iv) کیا جنگل ترتیب کا محتاج ہے؟

(v) مصنف کو اپنے ملازم کی کون سی عادت ناپسند ہے؟

۲۔ مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیے:

فقدان، خندہ، استہزا، اسیر، استغراق، انجماد، فراست، ارتقا، حصار، علم بردار، زمان مکان، ضوابط، گراں بار

۳۔ مناسب الفاظ سے خالی جگہ پر کیجیے:

(i) بے ترتیبی میں محبت ہے، لچک ہے اور............

(ii)............ کی تگ و دو تو ہمیشہ سے لب بام تک ہی رہی ہے۔

(iii) بے ترتیبی کی آوارہ خرامی ایک............ عمل ہے۔

(iv)............ کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی میں ہے۔

(v) انسان کی ساری عمر............ کو ترتیب دینے میں بیت جاتی ہے۔

۴۔ مصنف نے بے ترتیبی کے کون سے فوائد بیان کیے ہیں؟

۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ترتیب کے کون کون سے پہلوؤں کو ہدف تنقید بنایا ہے؟

۶۔ اس انشائیے میں قدرتی حسن اور بے ترتیبی میں کیا مماثلتیں بیان کی گئی ہیں؟

طنز و مزاح

طنز و مزاح اردو ادب کی باقاعدہ صنف نہیں ہے بلکہ ادب کے دو رنگ ہیں جو نظم و نثر دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ کبھی ساتھ ساتھ بولے جاتے ہیں اور کبھی الگ الگ اور دونوں میں معنی کے لحاظ سے فرق ہے۔

مزاح یا ظرافت ہنسانے والی بات کو کہتے ہیں۔ جہاں تک طنز کا تعلق ہے، وہ معاشرے کی ناہمواریوں اور اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ لیکن طنز چونکہ تلخ ہوتا ہے اس لیے اس میں مٹھاس پیدا کرنے کے لیے طنز نگار مزاح کا سہارا لیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے لیے طنز قابلِ مطالعہ بن سکے اور ساتھ ہی ساتھ ان زیادتیوں کی نشاندہی بھی ہو جائے جو کسی فرد یا کسی معاشرے پر کی جا رہی ہیں۔ گویا مزاح خالص مزاح بھی ہے اور دوسری طرف یہ طنز کو شوگر کوٹ بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصطلاحِ عام میں ''طنز و مزاح'' ادب کی ایک ہی صنف تصور کی جاتی ہے حالاں کہ یہ دونوں ادب کے دو مختلف مزاج ہیں لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ جب یہ دونوں ملا کر پیش کیے جاتے ہیں تو بیان زیادہ پر اثر اور دل نشین بن جاتا ہے۔ مزاح میں طنز اور طنز میں مزاح خود بخود پیدا ہوتا ہے لیکن اچھے طنز نگار اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تخلیقات میں مزاح طنز پر حاوی رہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھتے ہیں کہ مزاح میں طنز گم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ مقصد جو تخلیق میں پوشیدہ ہے ضرور پورا ہو جائے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کا رواج سودا سے شروع ہوا۔ یہ ہجو یہ صورت میں تھا۔ سودا کے بعد ظرافت کا رنگ انشا کی شاعری میں ملتا ہے۔ طنز و مزاح کی صحت مند اور خوشگوار روایت کا آغاز مرزا غالب سے ہوتا ہے۔ ان کے خطوط میں بھی مزاح کے بہترین نمونے پائے جاتے ہیں۔

غالب کے بعد مزاح نگاری اور ظرافت نے ''اودھ پنچ'' سے فروغ پایا جو ۱۸۷۷ء سے شروع ہوا۔ ''اودھ پنچ'' سے اردو ادب میں طنز و مزاح لکھنے والوں کی ایک بڑی کھیپ میدان میں آئی۔

''اودھ پنچ'' کے دور کے بعد جو مزاح نگار خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں ان میں فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی شامل ہیں اور انھیں اردو مزاح نگاری میں سند کا درجہ حاصل ہے۔ ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج نے مقبولیت حاصل کی۔ لیکن یہاں یہ مراد نہیں لینا چاہیے کہ طنز و مزاح صرف نثر تک محدود ہو کر رہ گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب کے یہ دونوں رنگ شاعری میں بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے اور آج بھی چل رہے ہیں۔

دورِ حاضر میں طنز و مزاح نے بہت ترقی کی ہے اور بے شمار ادیب اور شاعر اس صنفِ ادب میں مستند حیثیت رکھتے ہیں جن میں ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، ابراہیم جلیس، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور مشکور حسین یاد کے نام نمایاں ہیں۔

فکر تونسوی

ولادت: ۱۹۱۸ء　　　　وفات: ۱۹۸۷ء

فکر تونسوی کا اصل نام نارائن تھا۔ وہ ۷۔ اکتوبر ۱۹۱۸ء کوشجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی علاقہ تونسہ شریف (ضلع ڈیرہ غازی) تھا۔ ان کے والد کا نام دھنپت رائے تھا جو تجارت کرتے تھے۔

فکر تونسوی نے گورنمنٹ ہائی سکول تونسہ شریف سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں ایمرسن کالج ملتان میں داخلہ لیا لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ تعلیم کے دوران میں ہی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن سنجیدہ آغاز ۱۹۴۲ء میں اس وقت ہوا جب ان کی ایک نظم ''تنہائی'' مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوئی اور حلقہ ارباب ذوق نے اسے اس سال کی بہترین نظم قرار دیا۔ ۱۹۴۳ء میں ترقی پسند ادبی تحریک کے نمائندہ ترجمان ''ادب لطیف'' سے وابستگی اختیار کی۔ علاوہ ازیں ان کی تخلیقات ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا'' اور ''سویرا'' میں شایع ہوتی رہیں۔

۱۹۵۱ء کے بعد فکر تونسوی کی تصانیف کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جن کا ذریعہ اظہار صرف طنز و مزاح تھا۔ فکر نے وہی زندگی بسر کی جس کا وہ داستاں گو بنا، بہت کم لوگوں کو یہ صلاحیت عطا ہوتی ہے کہ اس دنیا میں رہ کر نہ صرف وہ دوسروں کے اندر جھانک سکیں بلکہ خود کو اس طرح بے نقاب کر سکیں کہ بدن پر سے چمڑی تک ادھڑ جائے۔

فکر کی ادبی صلاحیتوں کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے طنز کو بام عروج تک پہنچایا۔ اس نے طبقاتی کشمکش میں ایک کرب محسوس کیا۔ فکر، اُردو سے تمام عمر جڑا رہا اور یہ اس کے لیے فخر کی بات ہے کہ اس کی ادبی صلاحیتوں کی بدولت اُردو کا نام بلند ہوا۔ طنز و مزاح پر فکر کی کئی تصانیف شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں ''تیرِ نیم کش''، ''پروفیسر بدھو''، ''ماڈرن الہ دین''، ''آدھا آدمی''، ''آخری کتاب''، ''پیاز کے چھلکے''، ''چھلکے ہی چھلکے'' اور ''گھر میں چور'' اہم ہیں۔

فکر تونسوی

مجھے قتل کردو

جب شہر میں آئے دن قتل کی وارداتیں ہونے لگیں تو بے اختیار میرا جی چاہا کیوں نہ میں بھی قتل ہو جاؤں۔ شہر کے ہر معاملے سے میرا رابطہ رہا ہے تو اس معاملے میں شہر سے کیوں بچھڑ جاؤں۔ چنانچہ صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے ایک دو آدمیوں سے پوچھا بھی کہ مجھے قتل کر ڈالو۔ لیکن ایک نے جواب دیا کہ آج میں ایک قتل کر کے آ رہا ہوں اور میں ہفتے میں صرف ایک قتل کرتا ہوں۔ باقی چھے دن عبادت خدا میں صرف کرتا ہوں۔ لہٰذا آپ کو قتل کرنے کا موقع آئندہ ہفتے دے سکتا ہوں۔

دوسرے آدمی سے گزارش کی تو وہ بولا: میرے پاس ٹائم نہیں ہے، میں اپنے کام کے سلسلے میں ایک سرکاری افسر کے گھر رشوت دینے جا رہا ہوں۔ رشوت قتل سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

اگرچہ ان کورے جوابوں سے قدرے اُداس ضرور ہوا لیکن کمر ہمت باندھے رکھی۔ ارادہ جینوئن ہو تو اس کی تکمیل میں کوئی سدِّ راہ نہیں ہو سکتا۔ ہر روز اخبار میں دو چار قتلوں کی خبریں پڑھتا تو میرا حوصلہ اور بلند ہو جاتا۔ لیکن صرف حوصلے سے کچھ نہیں بنتا۔ قتل ہونے کے لیے قاتل کا ہونا ضروری ہے۔ اور قاتل ۔۔۔۔ ! مگر قاتل کہاں سے لاؤں؟

آخر ایک دن بیوی سے کہا ''جانِ من! کیا تمہیں معلوم ہے کہ شہر میں آج کل بہت قتل ہو رہے ہیں؟''

وہ بولی، ''ہاں ہو رہے ہیں''۔

میں نے کہا، ''تو کیوں نہ ہم دونوں بھی قتل ہو جائیں کیوں کہ دونوں جیون ساتھی ہیں۔ کرپٹ اور بددیانت سماج میں خواہ مخواہ جی رہے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے قتل ہو جائیں''۔

یہ سن کر بیوی شش و پنج میں پڑ گئی۔ مگر پھر قدرے توقف سے بولی:

''آپ کا حکم سر ماتھے پر، لیکن پھر سوچتی ہوں اگر آپ کے ساتھ میں بھی قتل ہو گئی تو آپ کا سیاپہ خلوصِ دل سے کون کرے گا؟ ہماری تہذیب کی صدیوں سے یہی روایت ہے کہ خاوند کے سیاپے کے لیے بیوی کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

بیوی نے تہذیب کی آڑ لی تو مجھے اُس کا جیون ساتھی ہونا مشکوک نظر آیا۔ جب گھر کے آدمی ساتھ نہ دیں تو کسی غیر سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کفِ افسوس مل کر غصّے سے کہ دیا۔

''تمہیں دراصل بیوہ کہلانے کا شوق ہے تو انشاءاللہ دو چار دنوں میں پورے بول حفظ کر لو۔ میں قتل ہونے کی خواہش کو روک نہیں سکتا''۔

اور میں قتل ہونے کے لیے گھر سے باہر نکل گیا۔

میرے گھر سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر پڑوسی جگن ناتھ کا مکان تھا۔ مکان کے باہر گتے پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ قاتل صاحبان یہاں پانچ دن پہلے ایک قتل ہو چکا ہے۔ براہ کرم اب کسی اور گھر رجوع کیجیے۔

بورڈ پڑھتے ہی میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ جگن ناتھ ایک بڑے اسمگلر کا چمچہ تھا۔ میٹرک فیل تھا۔ مگر کتنا خوش نصیب تھا کہ قاتل وہاں ایک قتل کر گئے۔ مگر میرے نصیب میں کوئی قاتل ہی نہیں، بزرگوں نے سچ کہا تھا کہ:

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے

جگن ناتھ سے میری بول چال بند تھی، کیونکہ اسمگلنگ کو میں فعلِ قبیح سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اس کے گھر کی کال بیل بجائی تاکہ اس سے معلوم کروں کہ آپ کے ہاں جو قاتل آیا تھا اس کا ایڈریس اور حلیہ ہی عنایت کر دیجیے۔ میں حاجت مند تھا اور حاجت مند تو چور کو بھی تھانے دار کہہ دیتا ہے۔

جگن ناتھ جی نمودار ہوئے۔ میں نے گلوگیر لہجے میں پوچھا۔ ''قبلہ! آپ کے ہاں کس کا قتل ہوا ہے؟''

وہ بولا: ''میرے چھوٹے بھائی کا۔ وہ بالکل معصوم اور بے گناہ تھا جی۔ اس سے تو بہتر تھا قاتل مجھے قتل کر جاتا۔ دراصل وہ قتل مجھے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن۔۔۔۔اب پوچھو مت جی! قاتل نے ہمارے گھر سے ایک امپورٹڈ وی سی آر اٹھایا۔ میرا بھائی اور اس کی بیوی وی سی آر چھیننے کے لیے آگے بڑھے تو قاتل نے میرے بھائی بے چارے پر گولی چلا کر اسے ڈھیر کر دیا پھر اس کی بیوی کو چھوڑ گئے، وی سی آر لے گئے۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا قاتل بڑا ادانا معلوم ہوتا ہے۔ کام کی چیز لے گیا بے کار چیز چھوڑ گیا۔ میں نے جگن ناتھ جی سے پوچھا۔

''قاتل کا نام کیا تھا؟''

وہ بولے، ''نام نہیں بتایا۔''

میں نے پوچھا:

''مگر آپ نے جو باہر بورڈ لگا رکھا ہے، وہ کون پڑھ سکے گا؟ قاتل حضرات تو ان پڑھ ہوتے ہیں۔''

''ارے نہیں صاحب! آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں؟ آج کل تو گریجویٹ اور ایم۔ اے پاس نوجوان تک قتل کرتے پھرتے ہیں۔ قتل کے بعد کار پر ہی لوٹ جاتے ہیں اور کسی ویران جگہ پر جا کر کار کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔''

''کار کو کیوں؟''

''کیوں کہ کار بھی چوری کی ہوتی ہے۔''

مجھے جگن ناتھ سے بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ گھر میں قتل ہوا اور قاتل کا نام تک معلوم نہیں کر سکے۔ تھانے میں نامعلوم قاتل کے خلاف ایف۔ آئی۔ آر درج کر کے خاموش ہو گئے اور چوری چھپے پھر اسمگلنگ کے دھندے میں لگ گئے۔ چنانچہ میں نے یاسیت کے عالم میں پولیس ہیڈ کوارٹر کو پبلک بوتھ سے ٹیلی فون کیا۔ وہاں ایک پولیس افسر میرے کلاس فیلو تھے۔ سوچا، شاید وہی میرے لیے کوئی قاتل مہیا کر

سکیں۔ ٹیلی فون پر عرض کیا۔ ہیلو بھرت لال جی! میرا قتل ہونے کا پروگرام ہے، کیا آپ کے پاس کوئی قاتل دستیاب ہو سکتا ہے؟

جواب آیا۔ ''ویری سوری قاتل تو کوئی موجود نہیں ہے کوئی اور خدمت بتائیے۔''

جی چاہا کہہ دوں، تم ہی آ کر مجھے قتل کر دو، تمھارے پاس پستول بھی موجود ہے۔ لیکن اتنی صاف گوئی کی جرأت نہیں ہوئی۔ پوچھا:

''کیا آپ کو معلوم ہے، شہر میں قتل کی بہت سی وارداتیں ہو رہی ہیں؟''

وہ بولے۔ ''ہاں ہو رہی ہیں۔''

''تو پھر آپ کوئی قاتل گرفتار نہیں کر سکے؟''

کہنے لگا۔ ''ارے بابا! یہی تو مصیبت ہے۔ جب بھی کسی موقع واردات پر پہنچتے ہیں، قاتل بھاگ چکے ہوتے ہیں۔''

''آپ گھر سے لیٹ چلتے ہوں گے۔''

''اجی کیا کریں، ہمارے قواعد وضوابط ہی ایسے ہیں۔''

میں نے پھر اپنی معلومات کے لیے پوچھ لیا۔ ''لیکن یہ تو آپ معلوم کر سکتے ہوں گے کہ قتل کی یہ مسلسل وارداتیں کیوں ہو رہی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''پانچ بڑے پولیس افسروں کی ہائی پاور کمیٹی بنا دی گئی ہے، جو ان وارداتوں کے پس منظر کی رپورٹ تیار کرے گی۔ مگر آپ کیوں قتل ہونے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں؟''

''جی اُوب گیا ہے دنیا سے۔''

''تو پھر خدا سے دعا کیجیے۔ اس کے پاس قاتلوں کی کوئی کمی نہیں۔''

''وہ بھی کر چکا۔ مگر لگتا ہے، خدا بھی غیر جانب دار ہو گیا ہے۔''

اس نے یہ کہہ کر مجھے تسلی دی کہ آٹھ دس دن انتظار کیجیے، شاید میں کسی قاتل کا پربندھ کر کے آپ کی خدمت میں بھیج سکوں۔

قاتل کی تلاش میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی اور قاتل کے بغیر قتل ہونا بالکل ایسے تھا جیسے پانی ملے دودھ کی چھاچھ میں سے مکھن نکالنا۔ مگر اس کے باوجود ہر روز ایک دو قتل ہونے کی خبریں آ رہی تھیں۔ گورنمنٹ ہر روز بیان دے رہی تھی کہ قاتلوں کی کھوج مسلسل جاری ہے۔ مگر اس سلسلے میں عوام کو بھی گورنمنٹ سے تعاون کرنا چاہیے۔ شاید مطلب یہ تھا کہ جو آدمی قتل ہونے لگے مرنے سے پہلے گورنمنٹ کو قاتل کا حلیہ ضرور بتا جائے۔

اچانک خیال آیا۔ شوبھانند کرائم برانچ رپورٹر سے رجوع کیا جائے یقیناً وہ کوئی معقول قاتل مجھے تلاش کر دے گا۔ چنانچہ اس کے گھر میں ٹیلی فون کیا۔

''ہیلو! مجھے شوبھانند جی سے ملا دیجیے۔''

بھرّائے ہوئے گلے والی زنانہ آواز نے جواب دیا۔ ''آہ! وہ پرسوں قتل ہو چکے ہیں۔''

''کس نے قتل کیا بھابھی؟''

''قاتل نے''

ہائے! شوبھانند کتنا خوش نصیب نکلا۔ مجھ سے بازی لے گیا اور قاتل کتنا کورذوق تھا۔ ضرورت مجھے تھی، قتل اسے کر گیا۔ لیکن اس کو رذوقی سے اتنا شعور ضرور ہو گیا کہ شوبھانند نے قاتلوں کے خلاف کوئی رپورٹ شائع کی ہوگی، جبھی اسے گولڈن چانس مل گیا۔

مگر ان متواتر مایوسیوں کے باوجود میرے قتل ہونے کا جذبہ ابھی تک مضبوط تھا۔ سمندر میں قاتلوں کی پے در پے طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں مجھے شہر کا پورا چکّر لگانا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ کوئی قاتل لہر مجھے بھی سرفراز کر دے۔ چاہے وہ لہر تیسرے درجے کی گھٹیا لہر ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ گھومتے گھومتے ایک فٹ پاتھ پر ایک مونچھل آدمی سے پوچھا:

''اے مشفق مہربان! کیا آپ کی جیب میں پستول ہے؟''

وہ بولا۔ ''جی نہیں! میرے پاس تو نہیں ہے، مگر میرے والد صاحب کے پاس تھا۔''

''وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''وہ پرلوک سِدھار گئے۔ مگر آپ پستول کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''آپ کی مونچھیں دیکھ کر میں ڈر گیا کہ آپ کے پاس پستول ضرور ہوگا جس سے آپ مجھے قتل کر دیں گے۔''

''ہی ہی ہی۔ مہربان! آپ بہت لیٹ ہو گئے۔ آج سے پانچ برس پہلے اپنا یہی پیشہ تھا لیکن ترک کر دیا۔ آج کل تو میں سبزی منڈی سے سیب خرید کر اپنی دکان پر بیچتا ہوں۔''

شاید اسے سبزی منڈی جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے مزید تضیع اوقات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ کے گرب کے بعد مجھے ادھیڑ عمر کی عورت نظر آئی جو اندر اور باہر سے سر سبز تھی لیکن مالا جپتے ہوئے آ رہی تھی۔ میں نے سوچا امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔ کئی مالا والی عورتیں بھی بڑی خونخوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس کے قریب پہنچا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ حیران مگر میں بے تاب۔ فوراً پوچھا:

''حضور! کیا آپ مجھے قتل کر سکتی ہیں؟''

وہ مسکرا کر بولی:

''کیا آپ شاعر تو نہیں ہیں؟''

''تھا کسی زمانے میں۔ لیکن اب صرف اپنا غیر شاعرانہ قتل چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے کوئی پاگل سمجھی۔ ٹاٹا کرتے ہوئے کہتی ہوئی گئی۔

''قہ قہ قہ۔ مجھے آج ایک نہایت ضروری شاپنگ کرنا ہے، قتل کے لیے پھر کبھی سہی۔''

آپ یہ مت پوچھیے کہ میں نے شہر کے آٹھ دس راہ گیروں سے پوچھا کہ ازراہ کرم مجھے قتل کرنا پسند کریں گے؟ مگر وہ میری بات سنتے ہی بھاگ گئے۔ جب کہ ایک آدمی کو تو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ایک بہت بڑے ساہوکار تک کی منت سماجت کی جو تاجرانہ منافقت کے باعث دو چار پیشہ ور قاتل رکھ لیتے ہیں اور مخالف تاجر کو ہلاک کرا دیتے ہیں۔ لیکن وہ ساہوکار بھی مکر گیا کہ میں ایسا مکروہ دھندا نہیں کرتا۔ میں تو ہر ماہ ویشنو دیوی کی یاترا پر جاتا ہوں۔

غرض حالات کو ناسازگار پا کر سڑک پر بیٹھے ایک بھکاری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی تنومند بھکاری تھا، کیا اس کی منت سماجت کروں؟ مگر نہیں، اچانک خیال آیا اسے فحش گالیاں دوں۔ کون جانے غصہ میں آ جائے اور چاقو نکال کر مجھے بھونک دے۔ چاقو اب اتنے عام ہو گئے ہیں کہ سائیکل رکشہ پلر[1] سے لے کر بھکاری تک جیب میں رکھنے لگے ہیں۔ چنانچہ میں نے چھوٹتے ہی اسے کہا۔

''بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

وہ بولا: ''جاؤ جاؤ معاف کرو بابا۔''

''معاف کرو کا کیا مطلب؟ کیا مجھے بھی اپنی طرح بھکاری سمجھے ہو، کلّے چیر دوں تمھارے؟''

ایک دم بھکاری بھڑک اٹھا۔

''میرے کلّے؟ تمھارا چڑیا اتنا جسم ہے اور میرے ایسے لوہے اور پتھر کے کلّے چیرو گے؟''

میں نے محسوس کیا اب کام بن گیا۔

''ارے چڑیا ہو گی تمھاری............! میں تو تیرا خون پی جاؤں گا۔ اٹھ کر سامنے تو آ جا! کیا تیرے پاس چاقو ہے؟''

وہ بولا۔ ''نہیں ہے''

''چلو! سامنے دکان سے تمہیں چاقو خرید دوں گا، تمہیں چاقو پکڑنا بھی آتا ہے، کبھی کسی کو قتل بھی کیا ہے............؟''

وہ بولا۔ ''گالیاں بند کرو چاقو لے دو، مگر قتل ہونے سے پہلے اپنی بیوی کا ایڈریس بھی دے جانا۔''

میں نے سوچا، بڑا تجربہ کار قاتل معلوم ہوتا ہے۔ پیچھے سنا تھا کہ سرکار نے تمام بھکاریوں کو شہر بدر کر دیا ہے۔ لیکن اب لگا کہ شہر میں جتنے قاتل کام کر رہے ہیں وہ سبھی بدر شدہ بھکاری ہوں گے۔ روزی روٹی کے لیے انسان کبھی بھکاری بن جاتا ہے کبھی قاتل۔ چلو، گندی اور فحش گالیوں کا آئیڈیا برا نہیں رہا۔ اتنی جدو جہد کے بعد کم از کم ایک قاتل تو ملا۔ جدو جہد ایمان داری سے کی جائے تو اس کا میٹھا پھل ضرور ملتا ہے، میرے لیے یہ بھکاری نہیں ہے، میٹھا پھل ہے۔

میں جانتا تھا چند گز کے فاصلے پر رام پوری تیز چاقوؤں کی ایک دکان کا مالک میرا دوست اور مداح تھا۔ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''فکر صاحب! کیا آپ کو اعلیٰ کوالٹی کا ایک چاقو بطور تحفہ دے دوں؟''

۱۔ Puller

اور میں نے مذاق میں اس سے کہا تھا۔ ''چاقو دینا ہے تو ایک پیٹ بھی ساتھ ہی دیجیے، جس میں بھونک سکوں۔''

بہرکیف اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی۔ لیکن آج سیریس معاملہ تھا۔ قاتل کو اپنے قتل کے لیے چاقو بھی خود خرید کر دینا پڑ رہا تھا۔ پیٹ بھی میرا اور چاقو بھی میرا۔ تین چار منٹ میں اس دکان پر پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد اس سے تیز دھار چاقو طلب کیا۔ اس نے چاقو کی بجائے کپا کولا کی بوتل پیش کر دی۔ میں نے کہا:

''پیارے بوتل کا عشق فی الحال ملتوی رکھو، مجھے فوراً چاقو چاہیے، ذرا جلدی ہے۔''

وہ ہنس کر بولا: ''جلدی کیا ہے، کیا کوئی بینک لوٹنا ہے؟''

میں چپ رہا۔

''کیا کسی جیولری شاپ پر حملہ کرنا ہے؟''

میں بدستور چپ رہا۔

''تو کیا کسی انتہا پسند گروہ کے ممبر بن گئے ہو؟''

میں چپ رہا۔ میری مسلسل خاموشی سے پریشان ہو کر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک تیکھا، چمکدار چاقو عنایت کر دیا۔ اس پر سے رام پور کی چھپی ہوئی مہر چھیل دی اور کہنے لگا:

''جناب چھرا تو حاضر ہے، مگر پیٹ کہاں ہے؟''

جی چاہا اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر دوں۔ لیکن دوستانہ مراسم کے باعث اتنا صحیح جواب نہیں دے سکا اور چاقو لے کر سیدھا جائے واردات پر پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں وہ بھکاری موجود نہیں تھا۔ میں نے قریب ہی بیٹھے پرانے جوتے گانٹھتے ہوئے ایک موچی سے پوچھا، ''کیوں جناب! یہ بھکاری صاحب کہاں چلے گئے؟''

وہ جیسے گنگناتے ہوئے بولا:

''مائی ڈیئر سر! گان ود دی ونڈ[1] یعنی وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا،

''یار! تم تو گریجویٹ معلوم ہوتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''اجی! اگر بجویٹ نہ ہوتا تو کیا یوں جوتے گانٹھتا؟''

1- My dear Sir! gone with the wind.

۲- پورا شعر اس طرح ہے: یہی ہر نفس ہے دعائے دل، کوئی ہے بے وفا نہ دُکھائے دِل
کہ جو بیچتے تھے دوائے دِل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے (اسیرؔ)

سوالات

1- مندرجہ ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

(i) فکر تونسوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ (ii) فکر تونسوی کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟

(iii) فکر کے والد کا نام کیا تھا؟ اور ان کا ذریعہ معاش کیا تھا؟ (iv) فکر تونسوی کی تخلیقات کن کن ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں؟

2- فکر تونسوی کے حالاتِ زندگی اور ادبی خدمات کا مختصراً ذکر کیجیے۔

3- درست جواب کے شروع میں "✓" کا نشان لگایے۔

(i) فکر تونسوی نمائندہ تھا:

(الف) ترقی پسند تحریک (ب) رومانوی (ج) ایہام گوئی (د) علی گڑھ تحریک

(ii) فکر تونسوی کی تصانیف کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا:

(الف) ۱۹۴۸ء کے بعد (ب) ۱۹۵۰ء کے بعد (ج) ۱۹۵۱ء کے بعد (د) ۱۹۷۷ء کے بعد

(iii) فکر تونسوی نے بلند مقام حاصل کیا:

(الف) سیاست میں (ب) تجارت میں (ج) طنز و مزاح میں (د) انشائیہ میں

4- خالی جگہ پر کیجیے:

(i) رشوت .... سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

(ii) ارادہ جینیوئن ہو تو اس کی تکمیل میں کوئی .... نہیں ہو سکتا۔

(iii) قتل ہونے کے لیے .... کا ہونا ضروری ہے۔

(iv) میں نے .... کے عالم میں پولیس ہیڈ کوارٹر کو پبلک بوتھ سے ٹیلی فون کیا۔

(v) پانچ بڑے پولیس افسروں کی ہائی پاور .... بنا دی گئی ہے۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کیجیے۔

کمر ہمت، سدِ راہ، شش و پنج میں پڑنا، کفِ افسوس ملنا، فعل قبیح

6- کالم "الف" کا ربط کالم "ب" میں تلاش کیجیے اور جواب کالم "ج" میں لکھیے۔

	کالم "الف"	کالم "ب"	کالم "ج"
1-	میں نے اس کے گھر کی	(الف) ان پڑھ ہوتے ہیں	
2-	قبلہ! آپ کے ہاں	(ب) بہت سی وارداتیں ہو رہی ہیں	
3-	قاتل حضرات تو	(ج) قتل چاہتا ہوں	
4-	شہر میں قتل کی	(د) کال بیل بجائی	
5-	اب صرف اپنا غیر شاعرانہ	(ہ) کس کا قتل ہوا ہے	

7- فکر تونسوی ترقی پسند ادبی تحریک کے عظیم نمائندہ تھے، بحث کیجیے۔

8- فکر تونسوی نے وہی زندگی بسر کی جس کا وہ داستان گو بنا۔ تنقیدی نوٹ لکھیے۔

مشتاق احمد یوسفی

ولادت: ۱۹۲۳ء

مشتاق احمد یوسفی راجستھان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست ''ٹونک'' کے ایک تعلیم یافتہ مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے نانا مسلم راٹھور تھے۔ان کے والد عبدالکریم خان یوسفی نے جے پور شہر میں کاروبار شروع کیا۔ بعدازاں جے پور میونسپل کمیٹی کے چیئرمین اور ریاستی اسمبلی کی حزب مخالف کے راہنما بھی رہے۔اسمبلی میں سقوط حیدرآباد کے بعد پاکستان کی حمایت میں تقریر کرنے پر ان کو ہجرت کر کے کراچی آنا پڑا۔

یوسفی صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور عربی، فارسی اور دینیات کے علوم پڑھے۔انٹرمیڈیٹ راجپوتانہ بورڈ سے درجہ اوّل میں پاس کیا۔ بی۔اے آگرہ یونیورسٹی سے اوّل درجہ میں پاس کیا اور ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے فلسفہ کی ڈگری بھی درجہ اوّل میں حاصل کی۔علی گڑھ کے تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے زیر اثر ان کے جوہر کھلے۔۱۹۴۶ء میں راجپوتانہ سول سروس میں شامل ہوئے اور ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے۔ پاکستان آنے کے بعد بطور منیجر مسلم کمرشل بنک اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پاکستان بینکنگ کونسل کے چیئرمین کے عہدے تک پہنچے۔

مشتاق احمد یوسفی ایک فطری مزاح نگار ہیں۔ان کی تحریروں میں اگرچہ سلیقہ مندی، رکھ رکھاؤ اور عبارت کی تزئین وآرائش کا خصوصی اہتمام ملتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے جملے رواں، شگفتہ اور بے ساختہ ہوتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں اور ایسے گہرے اور پوشیدہ معانی پیدا کرتے ہیں کہ وہ کسی مفکر کی بے ساختہ گفتگو کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ان کے بیشتر موضوعات ہماری روزمرہ زندگی اور معمولات سے لیے گئے ہیں لیکن وہ ان میں بھی مزاح کے انوکھے اور چونکا دینے والے گوشے تلاش کر لیتے ہیں، لیکن اس مزاح کی بنیاد ایک اعلیٰ تہذیبی شعور اور مذاق سلیم پر استوار ہوتی ہے۔

معروف نقاد مجنوں گورکھ پوری، یوسفی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ادنیٰ سے ادنیٰ بات کے کسی نئے پہلو یا زاویے پر ہلکی سی روشنی ڈال کر اس کی طرف ہم کو متوجہ کر کے چونکا دینا اور پھر خود معصومانہ انداز میں آگے بڑھ جانا یوسفی کے فن کی وہ نزاکت ہے جو انھی کے حصے میں آئی ہے۔''

یوسفی صاحب کا قلم جس موضوع کو چھوتا ہے اس میں نئی روئیدگی اور تازہ بالیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ان کی کوئی ترکیب ایسی نہیں ہوتی جو قاری کو فکر ونظر کی نئی روشنی نہ دے جاتی ہو۔

مشہور مزاح نگار اور شاعر ابن انشاء نے ان کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ اگر مزاحیہ ادب کے موجودہ دور کو ہم کسی نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ یوسفی ہی کا نام ہے۔

یوسفی صاحب کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں: ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن''، ''زرگزشت'' اور ''آب گم''۔

''خاکم بدہن'' پر انہیں آدم جی ادبی انعام بھی ملا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

کافی

میں نے سوال کیا ''آپ کافی کیوں پیتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا ''آپ کیوں نہیں پیتے؟''

''مجھے اس میں سگار کی سی بو آتی ہے۔''

''اگر آپ کا اشارہ اس کی سوندھی سوندھی خوشبو کی طرف ہے تو یہ آپ کی قوت شامہ کی کوتاہی ہے۔''

گو کہ ان کا اشارہ صریحاً میری ناک کی طرف تھا، تاہم رفع شر کی خاطر میں نے کہا ''تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے بھینی بھینی مہک آتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔''

تڑپ کر بولے ''صاحب! میں ماکولات میں معقولات کا دخل جائز نہیں سمجھتا، تاوقتیکہ اس گھپلے کی اصل وجہ تلفظ کی مجبوری نہ ہو۔۔۔ کافی کی مہک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہی سوندھا پن لگی ہوئی کھیر اور دھنگارے رائتے میں ہوتا ہے۔''

میں نے معذرت کی ''کھرچن اور دھنگار دونوں سے مجھے متلی ہوتی ہے۔''

فرمایا ''تعجب ہے! یوپی میں تو شرفا بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔''

''میں نے اسی بنا پر ہندوستان چھوڑا۔''

چراندے ہو کر کہنے لگے ''آپ قائل ہو جاتے ہیں تو کج بحثی کرنے لگتے ہیں۔''

جواباً عرض کیا ''گرم ممالک میں بحث کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ دانستہ دل آزاری ہمارے مشرب میں گناہ ہے۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا، لیکن اگر یہ سچ ہے کہ کافی خوش ذائقہ ہوتی ہے تو کسی بچے کو پلا کر اس کی صورت دیکھ لیجیے۔''

جھلا کر بولے ''آپ معصوم بچوں کو بحث میں کیوں گھسیٹتے ہیں؟''

میں بھی الجھ گیا ''آپ لوگ ہمیشہ بچوں سے پہلے لفظ معصوم کیوں لگاتے ہیں؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ بچے گنہگار بھی ہوتے ہیں؟ خیر آپ کو بچوں پر اعتراض ہے تو بلی کو لیجیے۔''

''بلی ہی کیوں؟ بکری کیوں نہیں؟'' وہ سچ مچ مچلنے لگے۔

میں نے سمجھایا ''بلی اس لیے کہ جہاں تک پینے کی چیزوں کا تعلق ہے، بچے اور بلیاں بُرے بھلے کی کہیں بہتر تمیز رکھتے ہیں۔''

ارشاد ہوا ''کل کو آپ کہیں گے کہ چونکہ بچوں اور بلیوں کو پکے گانے پسند نہیں آسکتے اس لیے وہ بھی لغو ہیں۔''

میں نے انھیں یقین دلایا ''میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا۔ پکے راگ اِنھیں کی ایجاد ہیں۔''

''آپ نے بچوں کا رونا بلیوں کا لڑنا۔۔۔۔''

بات کاٹ کر بولے ''بہر حال ثقافتی مسائل کا فیصلہ ہم بچوں اور بلیوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔''

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے عامہ کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرنا بڑی عاقبت نااندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بدمذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا۔ زندگی میں صرف ایک شخص ایسا ملا جو واقعی کافی سے بے زار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔ ایک صاحب اپنی پسند کے جواز میں صرف یہ کہ کر چپ ہو گئے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافی لگی ہوئی

بعض احباب تو اس سوال سے چراغ پا ہو کر ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جھوٹے الزام کو سمجھ دار آدمی نہایت اعتماد سے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ مگر سچے الزام سے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس ضمن میں جو متضاد باتیں سننا پڑتی ہیں، ان کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

ایک کرم فرمانے میری بے زاری کو محرومی پر محمول کرتے ہوئے فرمایا:

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

ان کی خدمت میں حلفیہ عرض کیا کہ دراصل بیسیوں گیلن کافی پینے کے بعد ہی یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ دوسرے صاحب نے ذرا کھل کر پوچھا کہ کہیں کافی سے چڑ کی اصل وجہ معدے کے وہ داغ تو نہیں جن کو میں دو سال سے لیے پھر رہا ہوں اور جو کافی کی تیزابیت سے جل اٹھتے ہیں اور اس کے بعد وہ مجھے نہایت تشخیص ناک نظروں سے گھورنے لگے۔

استصواب رائے عامہ کا حشر آپ دیکھ چکے۔ اب مجھے اپنے تاثرات پیش کرنے کی اجازت دیجیے۔ میرا ایمان ہے کہ قدرت کے کارخانے میں کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان غور و فکر کی عادت ڈالے (یا محض عادت ہی ڈال لے) تو ہر بری چیز میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر حقے ہی کو لیجیے۔ معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ حقہ پینے سے تفکرات پاس نہیں پھٹکتے۔ بلکہ میں تو یہ عرض کروں گا کہ تمبا کو خراب ہو تو تفکرات ہی کیا موقوف ہے، کوئی بھی پاس نہیں پھٹکتا۔ اب دیگر ملکی اشیائے خورد و نوش پر نظر ڈالیے۔ مرچیں کھانے کا ایک آسانی سے سمجھ میں آنے والا فائدہ یہ ہے کہ ان سے ہمارے مشرقی کھانوں کا اصل رنگ اور مزہ دب جاتا ہے۔ خمیرہ گاؤ زبان اس لیے کھاتے ہیں کہ بغیر راشن کارڈ کے شکر حاصل کرنے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے۔ جوشاندہ اس لیے گوارا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک ملکی صنعت کو فروغ ہوتا ہے بلکہ نفس امارہ کو مارنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ شلغم اس لیے زہر مار کرتے ہیں کہ ان میں وٹامن ہوتا ہے۔ لیکن جدید طبی ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ کافی میں سوائے کافی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اہل ذوق کے نزدیک یہی اس کی خوبی ہے۔

معلوم نہیں کافی کیوں، کب اور کس مردم آزار نے دریافت کی۔ لیکن یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یونانیوں کو اس کا علم نہیں تھا۔ اگر انھیں ذرا بھی علم ہوتا تو چرائتہ کی طرح یہ بھی یونانی طب کی جزوِ اعظم ہوتی۔ اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ہوتی ہے کہ قصبوں میں کافی کی بڑھتی ہوئی کھپت کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عطائیوں نے اللہ شافی، اللہ کافی، کہہ کر مئوخر الذکر کا سفوف اپنے نسخوں میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ زمانہ قدیم میں اس قسم کی جڑی بوٹیوں کا استعمال عداوت اور عقدِ ثانی کے لیے مخصوص تھا۔ چونکہ آج کل ان دونوں باتوں کو معیوب خیال کیا جاتا ہے، اس لیے صرف اظہارِ خلوص باہمی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سنا ہے کہ چائے کے بڑے خوب صورت باغ ہوتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہ ملتی بلکہ غلّہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلومات عامہ محدود ہیں مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اگتی ہوگی۔ کیونکہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طور یہ باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اگر کسی مُلک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اگتا ہوگا؟ ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے مُلک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھیے تو مجھے اپنا مُلک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں بھی اس رائے سے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں معلوم ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے جبھی تو لوگ دوڑ دوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

بہت دیر تک وہ یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کافی نہایت مفرح ہے اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی مثال دی کہ ''ابھی کل کا واقعہ ہے۔ میں دفتر سے گھر نڈھال پہنچا۔ بیگم بڑی مزاج دان ہیں۔ فوراً کافی کا Tea Pot لا کر سامنے رکھ دیا۔''

میں ذرا چکرایا ''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں نے دودھ دان میں سے کریم نکالی'' انھوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''شکر دان میں سے کیا نکلا؟''

فرمایا ''شکر نکلی اور کیا ہاتھی گھوڑے نکلتے؟''

مجھے غصہ تو بہت آیا مگر کافی کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

عمدہ کافی بنانا بھی کیمیا گری سے کم نہیں۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دونوں کے متعلق ہی سننے میں آیا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ ہر ایک کافی ہاؤس اور خاندان کا ایک مخصوص نسخہ ہوتا ہے جو سینہ بہ سینہ، حلق بہ حلق منتقل ہوتا رہتا ہے۔ مشرقی افریقہ کے اس انگریز افسر کا نسخہ تو سبھی کو معلوم ہے، جس کی مزے دار کافی کی سارے ضلع میں دھوم تھی۔ ایک دن اس نے ایک نہایت پرتکلف دعوت کی جس میں اس کے

حبشی خانساماں نے بہت ہی خوش ذائقہ کافی بنائی۔ انگریز نے بہ نظر حوصلہ افزائی اس کو معزز مہمانوں کے سامنے طلب کیا اور کافی بنانے کی ترکیب پوچھی۔

حبشی نے جواب دیا ''بہت ہی سہل طریقہ ہے۔ میں بہت سا کھولتا ہوا پانی اور دودھ لیتا ہوں۔ پھر اس میں کافی ملا کر دم کرتا ہوں۔''

''لیکن اسے حل کیسے کرتے ہو۔ بہت مہین چھنی ہوتی ہے۔''

''حضور کے موزے میں چھانتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم میرے قیمتی موزے استعمال کرتے ہو؟'' آقا نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔

خانساماں سہم گیا ''نہیں سرکار! میں آپ کے صاف موزے کبھی استعمال نہیں کرتا۔''

سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کافی کی تندی اور تلخی سے ذرا نہیں گھبراتا۔ بچپن ہی سے یونانی دواؤں کا عادی رہا ہوں اور قوتِ برداشت اتنی بڑھ گئی ہے کہ کڑوی سے کڑوی گولیاں کھانے سے بے مزہ نہ ہوا!

لیکن کڑواہٹ اور مٹھاس کی آمیزش سے جو معتدل قوام بنتا ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میری انتہا پسند طبیعت اس میٹھے زہر کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن دقت یہ آن پڑتی ہے کہ میں میزبان کے اصرار کو عداوت اور وہ میرے انکار کو تکلف پر محمول کرتے ہیں۔ لہٰذا جب وہ میرے کپ میں شکر ڈالتے وقت اخلاقاً پوچھتے ہیں:

''ایک چمچہ یا دو؟''

تو مجبوراً یہی گزارش کرتا ہوں کہ ''میرے لیے شکردان میں کافی کے دو چمچے ڈال دیجیے۔''

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورد و نوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے۔ مگر میں اس سلسلے میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنابریں میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں، میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے، ان پر دوزخ اور حمیم حرام ہیں۔

کافی امریکہ کا قومی مشروب ہے۔ میں اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ امریکی کلچر کافی کے زور سے پھیلا، یا کافی کلچر کے زور سے رائج ہوئی۔ یہ بعینہٖ ایسا سوال ہے جیسے کوئی بے ادب یہ پوچھ بیٹھے کہ ''غبارِ خاطر'' چائے کی وجہ سے مقبول ہوئی یا چائے ''غبارِ خاطر'' کے باعث؟ ایک صاحب نے مجھے لاجواب کرنے کی خاطر یہ دلیل پیش کی، امریکہ میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔ عرض کیا کہ جب خود قیدی اس پر احتجاج نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی کہ وکالت کریں۔ پاکستانی جیلوں میں بھی قیدیوں کے ساتھ یہ

سلوک روا رکھا جائے تو انسداد جرائم میں کافی مدد ملے گی۔ پھر انھوں نے بتلایا کہ وہاں لاعلاج مریضوں کو بشاش رکھنے کی غرض سے کافی پلائی جاتی ہے۔ کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا کلام ہے۔ میرا خیال ہے کہ دم نزع حلق میں پانی چوانے کے بجائے کافی کے دو چار قطرے ٹپکا دیے جائیں تو مریض کا دم آسانی سے نکل جائے۔ بخدا، مجھے تو اس تجویز پر بھی اعتراض نہ ہوگا کہ گناہ گاروں کی فاتحہ، کافی پر دلائی جائے۔

آپ کے ذہن میں خدانخواستہ یہ شبہ نہ پیدا ہو گیا کہ راقم السطور کافی کے مقابلے میں چائے کا طرف دار ہے، تو مضمون ختم کرنے سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں کافی سے اس لیے بے زار نہیں ہوں کہ مجھے چائے عزیز ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کافی کا جلا چائے پھونک کر پیتا ہے:

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چائے کے ارماں ہوں گے

(چراغ تلے)

سوالات

۱۔ مشتاق احمد یوسفی نے ''کافی'' میں جہاں جہاں رعایت لفظی سے مزاح پیدا کیا ہے ان کی نشاندہی کیجیے۔

۲۔ کافی اور چائے کا جو موازنہ مصنف نے کیا ہے، اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔

۳۔ مصنف کے خیال میں کافی پینے کے بعد جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسے بیان کیجیے۔

۴۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیجیے:

(i) یو۔ پی کس ملک میں ہے؟

(ii) کیمیا گری سے کیا مراد ہے؟

(iii) کافی کس ملک کا قومی مشروب ہے؟

(iv) ''غبار خاطر'' کس کی تصنیف ہے؟

(v) مشتاق احمد یوسفی کا مضمون ''کافی'' کس کتاب میں شامل ہے؟

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کو جملوں میں استعمال کیجیے:

رفع شر، قابلِ التفات، اہل ذوق، اظہار خلوصِ باہمی، چشم تخیل، قوتِ برداشت، دم نزع، انسداد جرائم

۶۔ خالی جگہ پر کیجیے۔

(i) میں ماکولات میں .... کا دخل جائز نہیں سمجھتا۔

(ii) کافی کی .... سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک تربیت یافتہ ذوق کی ضرورت ہے۔

(iii) گرم ممالک میں .... کا آغاز صحیح معنوں میں قائل ہونے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

(iv) کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسار رائے عامہ کرنا بڑی .... ہے۔

(v) حقہ پینے سے .... پاس نہیں پھٹکتے۔

(vi) کافی میں سوائے .... کے کچھ نہیں ہوتا۔

(vii) کافی کے سریع التاثیر ہونے میں کیا .... ہے۔

(viii) .... میں تو کافی اس قدر عام ہے کہ جیل میں بھی پلائی جاتی ہے۔

۷۔ مشتاق یوسفی کے فن کے بارے میں مجنوں گورکھ پوری کی کیا رائے ہے؟

۸۔ مشتاق یوسفی کے کوئی دو مجموعوں کے نام لکھیں۔

۹۔ موجودہ مزاحیہ ادب کے دور کو یوسفی کے نام سے کس نے منسوب کیا ہے؟

سفرنامہ

سفرناموں کی تاریخ بہت پرانی ہے اور ''ابنِ بطوطہ'' کا سفرنامہ ایک بہت بڑا حوالہ ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ماضی میں بہت سے سفرنامے لکھے گئے کیونکہ سفر اختیار کرنے کا شوق انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ گویا انسان کے مزاج میں تجسّس کا عنصر اسے اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ دور دراز علاقوں کا سفر کرے، اور نت نئی معلومات حاصل کر کے اپنے علم میں اضافہ کرے۔ دوسری جانب انسان ہمیشہ سے یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اپنے تجربات میں دوسرے لوگوں کو بھی شریک کرے۔

سفرنامے کا رنگ داستانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ناولوں، افسانوں، ڈراموں کے علاوہ مکاتیب میں بھی اس صنفِ ادب کا رنگ جا بجا بکھرا دکھائی دیتا ہے۔ دورِ حاضر کا سفرنامہ نہ تو محض رپورٹنگ ہے، نہ ہی محض جغرافیہ ہے، نہ ہی محض تاریخ ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں شخصیت نگاری بھی ہے، کہانیاں اور واقعات بھی ہیں، طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے اور حقائق پر مبنی جزئیات نگاری بھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ سفرنامے ایک حد تک مصنف کی خودنوشت بھی ہیں کیونکہ اس صنفِ ادب میں دوسری اصناف کی نسبت مصنف کی اپنی شخصیت زیادہ صاف اور واضح ہو کر پڑھنے والے کے سامنے آ جاتی ہے۔

اچھے سفرنامے لکھنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جن ممالک میں جائے وہاں کی زندگی کا بغور مطالعہ کر کے صرف وہی باتیں لکھے جو اس کے ہم وطنوں کے لیے نئی ہونے کے ساتھ ساتھ دل چسپ اور فکر انگیز ہوں۔

سفرنامے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر قاری بھی یوں محسوس کرے جیسے وہ بھی مصنف کے ہمراہ شریکِ سفر ہے اور سفر کے تمام نشیب و فراز میں اس طرح مصنف کے ساتھ ہے کہ جو کچھ مصنف محسوس کر رہا ہے، وہی سب کچھ اسے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ اگر قاری کا ذہن ان تمام باتوں کو جو مصنف نے تحریر کی ہیں قبول کر رہا ہے تو بلاشبہ سفرنامہ کامیاب ہے، لیکن اس کے برعکس اگر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ سفرنامے میں حقیقت کم اور افسانہ زیادہ ہے، یا اسے منطقی ربط کی کمی محسوس ہوتی ہے، یا وہ عقلی طور پر سفرنامے میں لکھی گئی باتوں کو تسلیم نہیں کر پاتا تو سفرنامہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی ادب میں اسے کوئی اعلیٰ مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ سفرنامے کا اصل جوہر مؤثر حقیقت نگاری ہے۔ تصنع، بناوٹ یا تکلف اس کے حسن کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ سفرنامے لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان سے اجتناب کرے۔

اردو ادب میں سفرناموں کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ غالباً اردو میں سب سے پہلا سفرنامہ یوسف کمبل پوش کا ہے۔ آزاد نے ایران کے سفر کا حال لکھا ہے۔ سر سید احمد خاں نے یورپ سے واپسی پر سفرنامہ لکھا ہے۔ ایک اہم سفرنامہ شبلی کا ''سفرِ روم و شام'' ہے۔ سر عبدالقادر نے اپنے سفرِ یورپ کا حال تفصیل سے لکھا ہے جو رسالہ ''مخزن'' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔

دورِ حاضر میں سفرنامے کو جن ادبا نے بلندیوں سے ہم کنار کیا، ان میں اشفاق احمد، ابن انشا، مستنصر حسین تارڑ، مختار مسعود، شیخ منظور الٰہی، سید اسعد گیلانی، قاضی ولی محمد، پروین عاطف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مختار مسعود

ولادت: ۱۹۲۷ء　　　　　　　　　　وفات: ۲۰۱۷ء

مختار مسعود سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا سے لے کر ایم۔اے تک تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ ان کے والد پروفیسر شیخ عطا اللّٰہ نے ۲۰ سال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اقتصادیات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مختار مسعود نے تحریکِ پاکستان میں ایک طالب علم کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا۔ علی گڑھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے سالہا سال وابستہ رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سول سروس آف پاکستان کے لیے منتخب ہوئے۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں اعلیٰ ترین سطح پر خدمات انجام دیں۔

مختار مسعود ایک کثیر المشاغل انسان ہیں۔ ان کی زندگی میں تعلیم، سفر، تحقیق، تصنیف، تقریر، فنونِ لطیفہ، نظامت، معیشت، مالیات، قانون سبھی کچھ شامل ہے۔

تحریکِ پاکستان میں ایک طالب علم کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہنے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی بیداری اور تحریکِ آزادی کی تفصیل ہے جسے انھوں نے ادبی چاشنی کے ساتھ بڑے مؤثر اور دل نشیں انداز میں لکھا ہے۔ آزادی کے بعد جوش اور جذبے کے سرد ہو جانے پر اجتماعی احساسِ زیاں کو جھنجھوڑا ہے۔

ان کے اسلوب میں بلا کی دل کشی ہے۔ انداز بیان منفرد ہے۔ عبارت نہایت بامحاورہ اور رواں ہے۔ وہ خود ہی سفر نہیں کرتے بلکہ اپنے قاری کو اپنے تمام جذبوں اور ولولوں کے ساتھ سفر میں شریک رکھتے ہیں۔ وہ سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ تاریخ کی بھی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ وہ اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ترقی کوشش اور محنتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو قومیں اس جذبے کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں، کامیابی ان کا مقدر بنتی ہے اور جب قومیں تن آسان اور جذبوں سے عاری ہو جاتی ہیں تو تاریخ انھیں معاف نہیں کرتی۔ اسے اپنی غلطیوں کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ان کے سفرنامے شعور اور احساس کے سفر سے عبارت ہیں۔

ان کی تصانیف میں ''آوازِ دوست''، ''سفرنصیب''، ''تاریخ کے عینی شاہد'' اور ''مغربی پاکستان کی سرزمین'' زیادہ مشہور ہیں۔

کتاب میں شامل اقتباس ان کی کتاب ''سفرنصیب'' سے لیا گیا ہے۔

سفر نصیب

ہوائی جہاز نے ایک طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ یہ مٹی کا لمبا چوڑا اور اونچا بند ہے۔ ایک ذرا سے حصے میں خلا ہے جسے اب پُر کر رہے ہیں۔ یہ بند کی تعمیر کا آخری مرحلہ ہے۔ چند سال ہوئے دریا کے دائیں کنارے ایک چھوٹا سا بند بنایا تھا جس میں کئی دروازے تھے۔ پہلے دریا کا رخ موڑ کر اسے ان دروازوں سے گزارا۔ پھر دریا کا پاٹ خالی ملا تو اس پر بڑا سا بند باندھ دیا اور پہاڑیوں میں لمبی لمبی سرنگیں کھود ڈالیں۔ اس کے بعد چھوٹے بند پر اتنی مٹی ڈالی کہ وہ اس کے نیچے دفن ہو گیا۔ ابھی اور مٹی ڈالیں گے یہاں تک کہ اس کی سطح بڑے بند کے برابر ہو جائے گی۔ پانی کا رخ ذرا دائیں جانب سرکا دیا ہے جہاں دو پیاسی سرنگوں کے دہانے اوک لگائے دریائے سندھ کو غٹا غٹ پی رہے ہیں۔ کبھی دریا یہاں سے دیوانوں کی طرح گزرتا تھا' منہ میں کف اور گریباں لیرلیر۔ اب جنون کو افاقہ ہے۔ ایک پرسکون چھوٹی سی جھیل بن گئی ہے۔ دریا اسی جھیل کے پنگوڑے میں پڑا سو رہا ہے۔ تربیلا تک یہ الھڑ دھارا بلا روک ٹوک چلا آیا مگر یہاں بند نے اس کا راستہ روک کر اسے کفایت اور کفالت کی نئی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اب اسے لہر لہر کے لیے جواب دینا ہو گا اور قطرے قطرے کا حساب رکھنا ہو گا۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان سے وقت کے دھارے اور اس کے لمحے لمحے کا حساب مانگا جائے گا۔ دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑتا ہے تا کہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند درکار ہے اور پیکرِ خاکی کو ضبط کا مضبوط بند۔ بلوچستان میں بہت سے پہاڑی ندی نالے ہیں جو چڑھتے تو بڑے زور شور سے ہیں مگر صرف ذرا سی دیر کے لیے اور تھوڑی دور تک۔ پاٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ اتنے رقبے پر پھیل جاتے ہیں کہ سارا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وہ میدان پار کرنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔ مسافر نے بہت سی باصلاحیت جوانیوں کو بلوچستان کے نالوں کی طرح چڑھتے اور سوکھتے دیکھا ہے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا اصول دولت' دریا اور جوانی تینوں پر بلا استثنا عائد ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز نے دوسری طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ تصویر کا نیا رخ سامنے آیا۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے اترا ہوا برف کا پانی اتنی دور آ کر اس جھیل میں جمع ہو رہا ہے۔ یہاں سے وہ ایک اور طویل سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ جھیل ان دنوں پایاب ہے۔ کل یہ بھر جائے گی۔ پھر رابطہ نہروں کے باریک بنے ہوئے جال اور زیرِ زمین آبی ذخیروں کے پیچیدہ نظام کی بدولت اس جھیل کا پانی دور دراز کے خشک علاقوں کو سیراب کرے گا۔ وہاں نئی فصلیں اور نئی نسلیں پیدا ہوں گی۔ فرد اور معاشرہ دونوں بدل جائیں گے۔ خانہ بدوش کاندھے سے گٹھر اتار کر زمین پر رکھ دے گا۔ سادگی کی جگہ پُرکاری لے گی۔ مویشیوں کی جگہ مشینیں نظر آئیں گی کیچڑ نچوڑ کر پینے والے گھاٹ گھاٹ کے مشروبات پئیں گے۔ الٹی کھال کی دیسی جوتی کی نسل در نسل کھلی رہنے والی دکان بند ہو جائے گی' درِ فتنہ باز ہو گا، عداوتیں بڑھ جائیں گی۔ خشک زمین سیراب ہو کر ستر پوش ہو گی' انسان خوشحال ہو کر عریاں ہو گا۔ اسباب و انجام کا نظام آبپاشی کے نظام سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ فرد' معاشرہ اور ملک کٹھ پتلی کی طرح اسباب کے دھاگوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کچھ دھاگے اتنے باریک ہیں کہ نظر نہیں آتے' کچھ اتنے گنجلک ہیں کہ دوسرا سرا نہیں ملتا۔

مسافر نے تربیلا کی پایاب[1] جھیل پر ایک نظر ڈالی۔ آنے والی برسات میں یہ بھر جائے گی۔ تعمیراتی سامان کا ملبہ اور ناکارہ مشینوں کے ڈھانچے پانی کی زد میں آنے والے ہیں۔ اُجاڑ کھیت' خالی گھر اور سنسان بستیاں سب جھیل کی نذر ہو جائیں گی۔ کچی پکی سڑکوں کا جال جو تعمیر کے دوران بنا تھا اب تہہ میں بیٹھنے والا ہے۔ کل بہت سی یادیں جو اس وادی اور اس بند سے وابستہ ہیں ایک بڑی اور گہری جھیل میں ڈوب جائیں گی۔ ڈوبتے کو بچانا فرض ہے اور مسافر ایک چھوٹی سی عمارت کے سلسلے میں یہ فرض پورا کرنا چاہتا ہے۔ جھیل کی سطح اس عمارت کی چھت سے بلند ہو چکی ہے۔ نظریں پانی کی بے نشان سطح پر اس مقام کو ڈھونڈ رہی ہیں جہاں کبھی ایک ڈاک بنگلہ ہوا کرتا تھا۔ دس برس ہوئے مسافر اس عمارت میں دو چار دن ٹھہرا تھا۔ وہ چھوٹا سا بنگلہ جنگل میں یوں کھڑا تھا جیسے ایک خوشنما کھلونا جسے کوئی بچہ دریا کے کنارے بھول آیا ہو۔ سفید عمارت جس کے برآمدے کی محرابیں سفید رنگ کی جالی سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دور سے عمارت ایسے لگتی جیسے کسی کا میچ کی فریم کی ہوئی تصویر وادی میں آویزاں ہو۔ تین چھوٹے چھوٹے کمرے' فرش پر کم قیمت اور سادہ قالین' ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کا ایک صوفہ بھی تھا' اس پر بیٹھتے ہی آدمی ماضی کی وسیع اور نرم آغوش میں گم ہو جاتا، جہاں سے اب ملک بھر میں بجلی فراہم کی جائے گی وہاں ان دنوں چراغ شام کو لو اٹھانے کے لیے مٹی کا تیل استعمال کرتے تھے۔ سہ پہر کو صاحب لوگ کے لیے باغ میں آرام کرسیاں لگ جاتیں اور ملازم دودھیا شیشے کی چمنیوں سے دھوئیں کی کالک چھٹانے میں مصروف ہو جاتے۔ وادی کا سارا حسن اس ڈاک بنگلے کے پائیں باغ میں اُمڈ آیا تھا۔ عمارت کی کرسی باغ سے گز بھر اونچی تھی مگر دریا کی سطح باغ کے بالکل برابر تھی۔ باغ اور دریا کی حد بندی پھولوں سے لدی پھندی کیاریوں نے کی ہوئی تھی۔ سبزے پر بیٹھ کر دیکھا تو سطح آب پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز پڑھی تو یوں لگا جیسے سجدہ آب رواں پر کیا ہو۔

جھک کر جھیل کے دو چکر لگانے کے بعد ہوائی جہاز نے رُخ سیدھا کیا اور شمالی پہاڑوں کی طرف اڑنے لگا۔ دریا کے اِس پار چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا بے ترتیب سلسلہ ہے۔ ان کے وسط میں ایک بہت بڑا میدان نظر آ رہا ہے۔ پہاڑیاں سبز اور سیاہ ہیں لیکن میدان سفید اور خاکستری۔ پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور جھنڈ ہیں لیکن میدان گنجا اور ننگا۔ پہاڑیاں پرانی ہیں اور میدان نیا۔ یہاں اس میدان کی موجودگی بالکل اوپری لگتی ہے۔ آخر پہاڑیاں اس جگہ پہنچ کر یکایک چار پانچ میل پرے کیوں ہٹ گئیں' جیسے کسی نے ہاتھ کے ایک اشارے سے انھیں بزمِ یار سے اٹھا دیا ہو۔ اس میدان میں مختلف گہرائیوں کے چوکور قطعے بنے ہوئے ہیں۔ پہلی نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے کروشیے سے بنی ہوئی چادر دھو کر پہاڑیوں کے درمیان سوکھنے کے لیے پھیلا دی ہے۔ جہاز اونچا ہوا، منظر اور تشبیہ بدل گئی۔ دوسری نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے شالامار بنانے کے لیے زمین کو درجہ بدرجہ تراشا ہو۔ یہ نامکمل شالامار بھی خوبصورت لگا۔ ایک ایک کر کے اس کے مختلف طبقے نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جیسے وہ پہاڑیاں جو کل تک اس میدان میں جمی کھڑی تھیں۔ یکے بعد دیگرے اس ملبے میں گم ہو گئیں، جس سے تربیلا بند کی تعمیر ہوئی ہے۔ جہاز آگے نکل گیا ہے اور میدان پیچھے رہ گیا ہے۔ منظر ہر لحہ بدلتا رہتا ہے۔ کل اس میدان کی صورت بھی نہ پہچانی جائے گی۔ کل اس نشیبی قطعے پر قبضہ جمانے کے لیے مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ اس مقابلے میں ہوا اور پانی' مٹی اور سبزہ' جانور اور انسان سب حصہ لیں گے۔ پہلے اس میں بارش کا پانی جمع ہوگا' کہیں دلدل بنے گی اور کہیں تالاب۔ سائبیریا سے مرغابیاں آئیں گی اور کسی نہ معلوم جگہ سے مچھلیاں اور مینڈک۔ جو رقبہ کھڑے پانی کی مار سے بچ رہا اس میں سبزہ اپنے پیر جمائے گا۔ نرم خودرو سبزے کے تعاقب میں سخت جان جھاڑیاں اور

---

[1] جسے پیدل پار کیا جاسکے

خودسر درخت آئیں گے۔ جنگل گھنا ہوا تو درندہ پناہ لینے اور آدمی لکڑی لینے کے لیے آنکلے گا۔ ہوا اور پانی دوسری پہاڑیوں کی مٹی ڈھو کر یہاں ڈالتے رہیں گے اور ایک نہ ایک دن اسی نشیب پر فراز کا قبضہ ہوگا۔ زمین کو ایک حالت پر قرار نہیں۔ اس کا نقشہ ہر دم بدلتا رہتا ہے۔ منظر کبھی ایک جگہ قیام نہیں کرتا' اس کی زندگی بس ایک جھلک تک ہے۔ اس کے بعد دوسرا منظر اس کی جگہ لے لیتا ہے اور تیسرا تعاقب میں ہوتا ہے۔ مناظر میں تسلسل ہوتا ہے تکرار نہیں ہوتی۔ ہر منظر جدید اور جدا ہوتا ہے۔ سمندر کی سطح لمحے بھر کے لیے بھی یکساں نہیں رہتی۔ صحرا میں ہر روز ایک نیا ریگ زار جنم لیتا ہے۔ جہاں آج پہاڑ نظر آتے ہیں وہاں کبھی سمندر ہوا کرتا تھا۔ آج جو پہاڑ میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں کل وہ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔

اِس وقت ہوائی سفاری کا بوئنگ سات سو سات بھی روئی کے گالے کی مانند بادلوں میں اڑ رہا ہے۔

(سفر نصیب)

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیجیے:

(i) ''آوازِ دوست'' کس کی تصنیف ہے؟ (ii) مختار مسعود کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۲۔ مختار مسعود کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ فرض اور شوق کے اعتبار سے مختار مسعود ایک کثیر المشاغل انسان ہیں۔ ''سفر نصیب'' کے حوالے سے بحث کیجیے۔

۴۔ مختار مسعود کے اسلوب میں بلا کی دلکشی ہے انداز بیان منفرد ہے۔ وہ خود ہی سفر نہیں کرتے بلکہ اپنے قاری کو اپنے تمام جذبوں اور ولولوں کے ساتھ سفر میں شریک رکھتے ہیں۔ بحث کیجیے۔

۵۔ ''سفر نصیب'' شعور اور احساس کے سفر سے عبارت ہے تنقیدی نظر ڈالیے۔

۶۔ خالی جگہ پُر کریں:

(i) انسان سے .... کے دھارے اور اس کے لمحے لمحے کا حساب مانگا جائے گا۔

(ii) چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا اصول دولت، دریا اور .... تینوں پر بلا استثنا عائد ہوتا ہے۔

(iii) .... معاشرہ اور ملک کٹھ پتلی کی طرح اسباب کے دھاگوں سے بندھے ہوئے ہیں۔

(iv) صحرا میں ہر روز ایک نیا .... جنم لیتا ہے۔

۷۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے۔

(i) دریا کو مٹی کا بند درکار ہے اور پیکر خاکی کو .... کا مضبوط بند۔

(الف) قانون (ب) ضبط (ج) انصاف (د) شرم و حیا

(ii) مغرب کی نماز پڑھی تو یوں لگا جیسے سجدہ .... پر کیا ہو۔

(الف) سخت چٹان (ب) روئی کے گالوں (ج) نرم سبزے (د) آبِ رواں

۸۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کیجیے:

آبِ رواں، پیکرِ خاکی، زیرِ زمین، سطحِ آب، بزمِ یار

مکتوب نِگاری

خطوط ایسا ذریعہ ہیں جن سے لوگوں کے متعلق ذاتی، شخصی اور انفرادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خط مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک امانت ہوتا ہے لیکن بعض عظیم لوگوں کی نجی تحریریں بھی اپنی زبان، اسلوب بیان اور تخیل کی بلندی کے باعث ان کی ذاتی نہیں رہتیں بلکہ ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔

بڑی شخصیتیں چاہے وہ ادبی دنیا سے متعلق ہوں یا سیاست و معاشرت کے مردمیدان ہوں، ان کو جاننا اور سمجھنا بھی قوم کی ذہنی تربیت کے لیے از حد ضروری ہے۔ جن شخصیات کی پبلک زندگی سے ہم واقف ہوتے ہیں، ان کی نجی زندگی بھی ہمارے لیے بڑی کشش رکھتی ہے۔ جو باتیں عام مجالس میں نہ کہی جا سکیں، خطوط ان گوشوں پر بھی روشنی ڈال دیتے ہیں۔ تاریخ کی بہت سی جزئیات اور شخصی تاثرات خطوں کے ذریعے ہی سے ہم تک پہنچے ہیں۔ جہاں لکھنے والے کی زندگی کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے، وہاں پورے معاشرے کا ذہن ہمارے لیے ایک واضح حقیقت کی مانند ہو جاتا ہے۔

کسی نثر پارے اور خاص کر اچھے مکتوب کی خوبی یہ ہے کہ اس کی تحریر سادہ ہونے کے باوجود لطیف اور دل کش بھی ہو۔ بیان میں سادگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہنے والا پوری دیانت داری اور خلوص سے ہر بات صاف کہہ دینا چاہتا ہے۔ اس طرح خطوط نگاری بول چال کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ اس انداز کو اپنانے میں مرزا غالب سب سے اول نظر آتے ہیں۔

بڑی سیاسی و ادبی شخصیات کے خطوط چونکہ اس دور کی سیاست، معاشرت اور اردگرد کے ماحول کے بھرپور عکاس ہوتے ہیں، اس لیے بعد میں آنے والے وقتوں میں یہی مکاتیب مستند تاریخی دستاویزات ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے متعلق مختلف لوگوں کے خطوط سے جو معلومات ملی ہیں وہ بعد کے مورخین کے لیے تاریخی حوالے سے بہت سودمند ثابت ہوئی ہیں۔

ادبا اور شعرا کی مشترکہ مساعی کے سبب آج مکتوب نگاری ادب کی ایک تسلیم شدہ صنف شمار کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکیٹ میں نامور ادیبوں اور شاعروں کے خطوط مجموعوں کی شکل میں دستیاب ہیں۔ حالی، آزاد، شبلی، سرسید، نذیر احمد، اقبال، اکبر، امیر مینائی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور پطرس بخاری کے بیشتر خطوط کتابی صورت میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ جن کے مطالعے سے اس دور کی طرزِ زندگی، تاریخ اور سماجی حالات کی تصویر سامنے آ جاتی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ مکاتیب، مکتوب نگار، شاعروں، ادیبوں یا سیاسی راہنماؤں کی خودنوشت سوانح عمریاں ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ادوار میں ادب جن نشیب و فراز سے دوچار رہا، دنیائے ادب میں جو تعمیری و مثبت کام ہوئے، مکاتیب ان سے متعلق ایک زندہ اور جیتی جاگتی دستاویزات کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پطرس بخاری، سعادت حسن منٹو، ابن انشا، محمد حسن عسکری، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وزیر آغا، فیض احمد فیض اور ن م راشد کے خطوط بھی شایع ہو چکے ہیں۔

علاّمہ محمد اقبالؒ

ولادت: ۱۸۷۷ء وفات: ۱۹۳۸ء

علامہ محمد اقبال اردو کے عظیم شاعر ہونے کے علاوہ عظیم مکتوب نگار بھی ہیں۔ جن کی مقبولیت ہمہ گیر ہے اور ان کے بارے میں ذرا ذرا سی تفصیل کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ علامہ کے مکتوب الیہم کا حلقہ اس قدر وسیع ہے کہ بے شمار شخصیات، معاصرین، رشتہ دار، مداحین، سیاسی راہنما، اخبار نویس، علما، شعرا اور اہلِ خانقاہ سب شامل ہیں۔

علامہ اقبال صرف اردو ہی میں خط نہیں لکھتے تھے۔ ان کے بہت سے خطوط انگریزی میں بھی ہیں اور چند خطوط جرمن، عربی اور فارسی میں بھی ملتے ہیں۔ علامہ اقبال خط کا جواب لکھنے میں بڑے مستعد تھے۔ فوراً جواب لکھتے۔ بیماری اور معذوری کے زمانے میں دوسرے سے لکھواتے تھے۔ البتہ خط لکھنے میں ان کے ہاں کوئی خاص اہتمام یا تصنع نہیں تھا۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ خطوط کی عبارت بھی عموماً بے تکلف ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملے لکھتے ہیں اور اس اختصار کے ساتھ بھی جامعیت ہوتی ہے۔ القاب وہ بہت مختصر اور مکتوب الیہ کے رتبے کی رعایت سے لکھتے ہیں۔

علامہ اقبال کے خطوط کے بہت سے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے دس پندرہ خطوط اپنی کتاب ''اتالیقِ خطوط نویسی'' میں شائع کیے تھے، باقی مجموعے درج ذیل ہیں:

''شاد اقبال''، ''اقبال کے خطوط جناح کے نام''، ''اقبال نامہ'' (حصہ اوّل دوم)

''انوار اقبال''، ''مکاتیب اقبال بنام گرامی''، ''اقبال از عطیہ بیگم''،

''نوادر اقبال''، ''کلیات مکاتیب اقبال'' (۳ جلدیں)، ''خطوطِ اقبال''۔

چند سال پہلے مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے تمام خطوط کو چار ضخیم جلدوں میں بڑی چابک دستی سے مدوّن و مرتب کر کے شایع کیا ہے۔

مکاتیبِ اقبال

(۱)

اکبرالہ آبادی کے نام

لاہور

۹ر نومبر ۱۱ء

مخدومی السّلام علیکم! آپ کے دونوں نوازش نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔ الحمدللہ کہ جناب خیریت سے ہیں۔

ترکوں کی فتح کا مژدۂ جانفزا پہنچا۔ مسرّت ہوئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔ لاہور کی بستی میں کوئی ہمدم دیرینہ نہیں۔ نام ونمود پر مرنے والے بہت ہیں۔ قومی جلسوں سے بھی پہلوتہی کرتا ہوں۔ ہاں آپ کے خطوط جو میرے پاس سب محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجیے مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں۔ یہ ایک قسم کی روحانی خودغرضی ہوگی جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے۔ آپ کی ملاقات کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ خدا جلد کوئی سامان پیدا کرے۔ کیا آپ دربار کے موقع پر دہلی تشریف لائیں گے؟

زمیندار میں یہ پڑھ کر نہایت افسوس ہوا کہ ''اُردو شاہنامہ'' تلف ہوگیا۔ جو شعرا اس میں سے شایع ہوئے ہیں وہ بڑے زور کے ہیں۔

رگ رگ موج سے خون جاری کریں

اس مصرع پر تو فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے۔

ہاشم[۱] عمرہٗ کو میری طرف سے بہت بہت پیار کیجیے۔ میری روح کو اس نام سے ایک خاص تعلق[۲] ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس بچے کی عمر دراز کرے اور دین دنیا میں اسے بامراد کرے۔ سکول کی خواندگی میں اس کا وقت ضرور ضائع ہوتا ہوگا۔ مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیرانِ مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔ یہی نظر صبغۃ اللہ ہے واحسن فی صبغۃ اللہ[۳]۔

۱۔ ہاشم اکبرالہ آبادی کے صاحب زادہ کا نام ہے۔

۲۔ ہاشم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِّ امجد ہیں اور آپؐ ہاشمی کہلاتے ہیں، یہی سبب روحانی تعلق کا ہوسکتا ہے۔

۳۔ یہاں اقبال سے سہوِ قلم ہوا ہے صحیح یوں ہے: صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً ''اللہ کا رنگ اور کس کا رنگ اس سے چوکھا ہے؟'' قرآن (۲:۱۳۸) (مؤلف)

اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیرانِ مشرقی دنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بدنصیب ہوں گے۔

میاں ہاشم اب وقت ہے اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیر مشرق سے لے سکتے ہو لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔

خادم

محمد اقبال

لاہور

(۲)

خان محمد نیاز الدین خاں کے نام

لاہور

۲۵ / جون ۱۹۲۳ء

مخدومی جناب خان صاحب! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے

آپ کے مضمون کا دوسرا حصہ مسلم آؤٹ لُک [1] میں شایع ہو گیا ہے۔ آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہو گا۔ مرزا جلال الدین صاحب نے بھی اس کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ جو میں نے نہیں دیکھا۔ وہ ذکر کرتے تھے کہ مسلم آؤٹ لُک میں شایع ہو گا۔ آپ کے دوست ضرور آپ کے ہم خیال ہوں گے۔ مگر اقبال فنڈ قائم کرنا میری رائے میں جس میں میرے ضمیر کی آواز بھی شامل ہے، درست نہیں۔ مسلمان غریب قوم ہیں اور باوجود اس غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ چندوں میں دے چکے ہیں۔

میں خود تو یہاں تک احتیاط کرتا ہوں کہ جو لوگ کتاب کو پڑھ نہیں سکتے، وہ اسے خرید بھی نہ کریں، کیونکہ ان کو اس کی خریداری کی ترغیب دینا ایک قسم کی ناانصافی ہے۔ باقی رہا میں، سو میری طرح اُمّتِ مرحومہ میں سیکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنھوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے بھی جہاں تک ہو سکے گا انھیں کی تقلید کروں گا۔ شاید آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھ سے کونسل کی اُمیدواری کے متعلق دریافت کیا تھا۔ سو عرض ہے کہ لاہور کے مسلمانوں نے مجھ سے بہت کہا مگر میں نے انکار کر دیا۔ لیکن اب تک انکار اصرار بدستور جاری ہے۔ تقریباً ہر روز ان کا ایک نہ ایک وفد آ جاتا ہے۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

---

[1] Muslim Outlook

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیے:

(i) علّامہ اقبال کی تاریخ پیدائش اور وفات لکھیے۔

(ii) علّامہ اقبال کے خطوط کے دو مجموعوں کا نام لکھیے۔

(iii) علّامہ اقبال نے کس کس زبان میں خطوط لکھے۔

۲۔ علّامہ اقبال کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ علامہ اقبال خطوط نویسی کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرتے ہیں۔ خطوط کی عبارت بھی بے تکلفانہ ہے۔ اظہار رائے کیجیے۔

۴۔ اکبر الہ آبادی کے نام خط میں علامہ اقبال نے کن جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے؟ مختصراً لکھیے۔

۵۔ علامہ اقبال نے کس مصرعے کے بارے میں کہا کہ اس پر فردوسی اور نظامی بھی رشک کرتے ہیں؟ اس مصرعے کا مفہوم بھی لکھیے۔

۶۔ خان محمد نیاز الدین خاں کے نام خط میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ مختصراً لکھیے۔

سید سلیمان ندوی

ولادت:۱۸۸۴ء　　　　وفات:۱۹۵۳ء

سید سلیمان ندوی کا تعلق بہار کے ایک قصبے دیسنہ سے تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کی مشہور درس گاہ ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ندوۃ العلماء میں دوسرے اساتذہ کے علاوہ انھیں مولانا شبلی نعمانی کی شاگردی کا فخر بھی حاصل ہوا۔ سید سلیمان ندوی نے کچھ دن معلمی کے فرائض انجام دیے۔ بعدازاں وہ مولانا شبلی کے ادارے دارالمصنفین سے وابستہ ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ حکومتِ پاکستان کی دعوت پر کراچی آگئے تھے۔

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں بھی اس ہمہ جہت عالمانہ شخصیت کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اپنی تمام زندگی علم وادب اور ملک وقوم کی خدمت میں بسر کی۔ ان کی زندگی مسلسل عمل اور جہد سے عبارت ہے۔ لہٰذا ان کے خطوط میں بھی ان کی اسی زندگی کی ہمہ جہتی اور عمل وجہد کی مقصدیت حاوی ہے۔ ان کے مکتوبات میں باہمی تعلقات، نجی معاملات اور شخصیت کے ذاتی اور مخفی پہلو کم اور اجتماعی، مذہبی ومعاشرتی مسائل اور قومی معاملات زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت کا رچاؤ اور ہمہ گیری ان میں جھلکتی ہے۔

سید سلیمان ندوی کے خطوط کا مطالعہ ہمارے سامنے ہماری قومی زندگی کے ایک نہایت ہی پُرآشوب عہد کے ایسے پہلو بھی لاتا ہے جو بصورتِ دیگر ہم سے پوشیدہ رہتے۔ اس طرح ان کے خطوط کا مطالعہ صرف ذاتی اور ادبی نقطۂ نظر سے ہی نہیں قومی اور تاریخی حوالوں سے بھی بامعنی اور اہم ہے۔

سید سلیمان ندوی کے مکتوبات کے چار مجموعے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ''بریدِ فرنگ'' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۰ء میں یورپ سے ہندوستان کے بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کو لکھے اور ان میں سیاسی پس منظر، یورپ کے حالات اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔ ''مکاتیب سید سلیمان ندوی'' مولانا مسعود عالم ندوی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ سید عبدالماجد دریابادی نے اپنے نام لکھے گئے خطوط کو ''مکتوباتِ سلیمانی'' کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سے خط ''معارف'' میں بھی شایع ہوئے۔ علاوہ ازیں بہت سے خطوط ایسے بھی ہیں جو ابھی تک شایع نہیں ہو سکے۔

مکتوبِ سید سلیمان ندوی بنام مولانا عبدالماجد دریابادی

لندن-کرزن ہوٹل

۴/ مارچ ۱۹۲۰ء

ولایتی مسافر کا سلام لیجیے

اٹلی، سوئٹزر لینڈ اور فرانس سے انگلینڈ ایک ہفتہ گزرا کہ ہمارا وفد پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ پیرس کچھ دن قیام ہوگا مگر پیرس پہنچ کر اخبارات سے معلوم ہوا کہ کل ہی شب کو ہاؤس آف کامن[1] میں مسئلہ ٹرکی پر بحث ہونے والی ہے۔ اس لیے دوسرے ہی دن جس طرح بنا بھاگ کر انگلینڈ پہنچے، جہاں آدھا مناظرہ ختم ہو چکا تھا۔ تمام ممبروں کی تقریریں تعصب سے لبریز تھیں۔ ہم مسلمانوں کو تو تعصب پر طعنہ دیا جاتا ہے مگر یہ کیا چیز ہے جو تمام یورپ میں نظر آرہی ہے؟ روزانہ مشہور اخباروں کے نامہ نگار ملاقات کو آتے ہیں اور ہمارے مکالمے اور پیغام کو شائع کر رہے ہیں۔ پرسوں شب کو پروفیسر آرنلڈ ملنے آئے، خاص طور سے دارالمصنفین اور سیرت کا تذکرہ کیا۔ دل چسپی لی۔ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں کے دکھانے کا وعدہ کیا۔ کل شب کو مسٹر فشر نے بحیثیت قائم مقام وزیر ہند (مانٹیگو صاحب آج کل نہیں ہیں) وفد کو باریاب کیا۔ مسٹر محمد علی اور سید حسین صاحب نے اپنے مطالبات نہایت دلیری اور صفائی سے پیش کیے۔ پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسئلہ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی مذہبی حیثیت ظاہر کرنے کی خاطر ان سے کہا کہ میں کوئی پولیٹیکل آدمی نہیں۔ مذہبی اور علمی آدمی ہوں اور علما کی جماعت کا قائم مقام ہوں۔ میرا اس وفد میں شامل ہو جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جن مطالبات کو پیش کرتے ہیں وہ سراسر مذہبی ہیں۔ فشر صاحب بڑے غور سے ایک ایک لفظ کو سن رہے تھے اور پھر نہایت متانت اور خندہ جبینی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم حتی الامکان مسلمانانِ ہند کے جذبات کا ضرور خیال رکھیں گے۔

آج مورننگ پوسٹ میں ایک اطالین پروفیسر مشرقیات (رومن یونیورسٹی) کے حوالے سے ''سلطان بحیثیت خلیفہ'' ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ میں نے آج اس کا جواب لکھا ہے۔ دیکھیے کون سا اخبار چھاپے۔ کم بخت کہتا ہے بغداد کی تباہی کے بعد سے خلافت دنیائے اسلام میں رہی ہی نہیں۔ ''نیچر آف خلافت'' ان کا ایک رسالہ ہے جو اطالین وزارت خارجہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

یہاں کے مستشرقین میں پروفیسر براؤن ہمارے ساتھ ہیں اور مارکولیوتھ مخالف۔ براؤن کو چار صفحوں کا عربی میں مسائل پر پھر ایک خط لکھا ہے اور ان سے تائید چاہی ہے۔ اپنی کتابیں بھی بھیجی ہیں۔ جواب آئے تو مطلع کروں گا۔ دیگر مستشرقین سے بھی اس سلسلہ میں خط کتابت کا ارادہ ہے۔ آج برٹش کانگریس کمیٹی کی طرف سے ہمارے فوٹو لیے جائیں گے۔ شام کو مصریوں کی طرف سے دعوت ہے۔ مسٹر امیر علی بھی اس مسئلہ میں اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بعض مسلمان انگریز ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چار پانچ روز ہوئے انھوں نے وفد کو چائے کی دعوت دی تھی۔ اپنی کارگزاریاں بیان کیں۔ انھوں نے اپنا پروپیگنڈا اس طرح پھیلایا ہے کہ وہ تمام دنیائے عرب پر چھا گیا ہے۔ سردی بے حد ہے۔ ''معارف'' کا خدا حافظ!

والسلام

سید سلیمان ندوی

سوالات

۱۔ جب زندگی ایک مقصد کی خاطر سنجیدگی سے وقف کر دی جائے، تو پھر نجی تحریریں بھی اسی طرح سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ کیا سید سلیمان ندوی کے زیرِ نظر خط سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے؟

۲۔ جہاں تک مسلمانوں کی بہتری کا سوال ہے، سلیمان ندوی اپنے استاد علامہ شبلی کی طرح بے چین رہتے ہیں۔ کیا اس خط سے یہ اثر جھلکتا ہے؟

---

[1] House of Common (ایوانِ عام)

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ولادت: ۱۹۴۹ء

ڈاکٹر انعام الحق جاوید فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ایف اے تک تعلیم ڈیرہ اسماعیل خان میں حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے اردو (۱۹۷۴ء) اور ایم۔اے پنجابی (۱۹۷۶ء) امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ہی پنجابی میں ''پنجابی ادب دا ارتقاء (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۹ء)'' کے موضوع پر ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ملازمت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۲ء میں اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد میں ریسرچ آفیسر کے طور پر کیا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۸۴ء سے جون ۱۹۹۷ء تک مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد میں ماہانہ رسالے ''اخبار اردو'' کے مدیر اور شعبہ دار التصنیف کے انچارج کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ جون ۱۹۹۷ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد میں ''شعبہ اردو و پاکستانی زبانیں'' کے چیئرمین کے طور پر تعینات ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں الگ سے ''شعبہ پاکستانی زبانیں'' کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس شعبے کے پہلے چیئرمین مقرر ہوئے جہاں سے آپ نے ایم فل ''پاکستانی زبانیں وادب'' کا اجراء کیا جو وطنِ عزیز میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔ آج کل آپ ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہومنیٹیز کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

پاکستانی ٹیلی وژن کے اردو اور پنجابی کے کئی ادبی پروگراموں (بشمول سانجھاں وسخن رنگ) کے مستقل کمپیئر رہے۔ اردو اور پنجابی میں تحقیق وتنقید وتراجم کے حوالے سے آپ کی ۱۶ سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے بعض کو اعلیٰ سطح کے حکومتی ایوارڈ بھی دیئے گئے۔ چند نمایاں ترین کتابوں کے نام یہ ہیں:

''پنجابی ادب دا ارتقاء ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۲ء''، ''Pakistan in Punjabi Literature''، ''بیرونی ممالک میں اردو''، ''پنجابی زبان وادب کی مختصر تاریخ''، ''پاکستانی زبانوں میں منتخب کلام اقبال کے منظوم تراجم''، ''بلھے شاہ: منتخب اردو تراجم'' (بہ اشتراک)، ''کلام بلھے شاہ مع اردو ترجمہ'' (بہ اشتراک)، ''کلام شاہ حسین مع اردو ترجمہ'' (بہ اشتراک)، ''کلام سلطان باہو مع اردو ترجمہ'' (بہ اشتراک)، اس کے علاوہ اردو اور پنجابی میں سنجیدہ شاعری اور مزاحیہ شاعری پر مشتمل آپ کے بارہ سے زائد مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

میاں محمد بخشؒ

ولادت: ۱۸۳۰ء　　　　وفات: ۱۹۰۴ء

میاں محمد بخشؒ پنجابی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ وہ کھڑی شریف ضلع میر پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان سلسلہ قادریہ میں بیعت تھا۔ ان کے والد گرامی میاں شمس الدین اپنے وقت کے ممتاز صوفی تھے۔ ان کی وفات کے بعد، میاں صاحب ان کے خلیفہ اور جانشین مقرر ہوئے۔ وہ بڑے عالم فاضل انسان تھے۔ رشد وہدایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رکھا۔ پندرہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، مگر اس میدان میں ان کی تمام تر شہرت اور ناموری کا باعث ان کی مثنوی ''سیف الملوک'' ہے۔ ''سیف الملوک'' پنجابی شاعری کا شاہکار تسلیم کی گئی ہے۔ میاں صاحب زندگی کے مختلف رویوں کو اس طرح اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں کہ ان کے ہاں زندگی اپنی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اخلاقی اور آفاقی اقدار کی ترجمانی بھی ان کے کلام کے بنیادی اوصاف کی آئینہ دار ہے۔ وہ پنجابی ادبیات کے مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ کھڑی شریف میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

کم ذاتوں کی یاری سے کب فیض کسی نے پایا
کیکر پر انگور چڑھایا ہر خوشہ زخمایا

☆☆......☆☆......☆☆

جائز ہوتی اور کے ہاتھوں جو خدمت دلبر کی
بادشہوں کے بدلے ساری خلق نمازیں پڑھتی

☆☆......☆☆......☆☆

درد مندوں کے سخن کی دے گواہی اس کا حال
جس پلو میں پھول بندھے ہوں مہکے وہ رومال

☆☆......☆☆......☆☆

سانس کا نہیں بھروسہ کچھ تو کس شے پر اترانا
لاکھ بدن کو جھاڑیں پونچھیں ہے یہ خاک سمانا

☆☆......☆☆......☆☆

بُری گھڑی میں کام آتی ہے بس اچھوں کی یاری
ہر دَم قول نبھاتے ہیں، انسان جو ہوں کرداری

☆☆......☆☆......☆☆

جب کھیتی ویران ہوئی اور خوشہ خوشہ ترسا
پھر کیا دھوپ جو نکلی بھی اور پھر کیا مینہ گر برسا

☆☆......☆☆......☆☆

ہمت بالکل بھی مت ہارو نہیں یہ صرف دلاسا
بھوکا مانگنے چلے تو اک دن بھر جاتا ہے کاسا

☆☆......☆☆......☆☆

ہر ہر دم بے شک نہ ملیں پر ملیں تو ہنس کر ملیں
ایسے میٹھے بول الاپیں، دل میں پھول کھلیں

☆☆......☆☆......☆☆

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(i) میاں محمد بخشؒ کہاں پیدا ہوئے؟

(ii) میاں محمد بخشؒ کی شہرت عام کا باعث کون سی تخلیق ہے؟

(iii) میاں محمد بخشؒ کی وفات کب ہوئی اور آپ کہاں مدفون ہیں؟

(iv) ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ملازمت کا آغاز کس محکمے سے کیا؟

(v) ڈاکٹر انعام الحق جاوید کس ادارے میں اور کس حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں؟

۲۔ میاں محمد بخشؒ نے نیچ لوگوں کی دوستی کو کس مثال سے واضح کیا ہے؟

۳۔ اپنے آپ پر اترانے والوں کو میاں محمد بخشؒ کیا درس دیتے ہیں؟

۴۔ میاں محمد بخشؒ کے مطابق بُرے وقت میں کون لوگ ساتھ دیتے ہیں؟

۵۔ آپ کو میاں محمد بخشؒ کے ترجمہ کردہ شعروں میں سب سے زیادہ پسند کون سا شعر ہے؟ وجہ بیان کریں۔

۶۔ میاں محمد بخشؒ اور ان کے کلام بارے مختصر نوٹ لکھیں۔

۷۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

جب کھیتی ویران ہوئی اور خوشہ خوشہ ترسا
پھر کیا دھوپ جو نکلی بھی اور پھر کیا مینہ گر برسا

☆☆......☆☆......☆☆

درد مندوں کے سخن کی دے گواہی اس کا حال
جس پلو میں پھول بندھے ہوں مہکے وہ رومال

☆☆......☆☆......☆☆

۸۔ خالی جگہ پُر کر کے مصرعے مکمل کیجیے:

(i) لاکھ بدن کو جھاڑیں پونچھیں ہے یہ .... سمانا

(ii) ہر دَم قول نبھاتے ہیں، انسان جو ہوں...............

(iii) بھوکا مانگنے چلے تو اک دن بھر جاتا ہے ....

(iv) ہر ہر دم بے شک نہ ملیں پر ملیں تو............... ملیں

☆☆......☆☆......☆☆

رضا ہمدانی (مترجم)

ولادت: ۱۹۱۰ء

آپ کا پورا نام میرزا رضا حسین ہمدانی ہے لیکن ادبی حلقوں میں اپنے قلمی نام ''رضا ہمدانی'' سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۰ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد منشی فاضل اور پشتو فاضل کیا اور محکمۂ صحت میں ملازم ہوگئے۔ بعد میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس، لوک ورثے کا قومی ادارہ اسلام آباد میں بطور محقق پشتو، ہندکو ادب اور ریجنل ڈائریکٹر برائے صوبہ سرحد خدمات انجام دیں۔

آپ کو اردو، انگریزی، پشتو، ہندکو، فارسی اور کشمیری زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ملک اور بیرون ملک بہت سی علمی ادبی محفلوں، کانفرنسوں، مذاکروں اور مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے میں اس قدر ملکہ رکھتے ہیں کہ ان کے ترجمے پر طبع زاد تخلیق کا گمان ہونے لگتا ہے۔

آپ کی علمی ادبی خدمات کے صلے میں ہمدرد پاکستان کراچی، پاکستان رائٹرز گلڈ، انجمنِ ترقی اردو پاکستان جیسے معروف اداروں نے آپ کو انعامات سے نوازا ہے اور آپ صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی بھی پا چکے ہیں۔

رضا ہمدانی کے اردو غزل کے دو مجموعے ''رگِ مینا'' اور ''صلیبِ فکر'' کے علاوہ ہندکو میں شعری مجموعہ ''مٹھے ڈنگ'' منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

☆☆......☆☆......☆☆

رحمان بابا (شاعر)

ولادت: ۱۶۳۲ء

نام عبدالرحمان ہے۔ آپ ۱۰۴۲ھ بمطابق ۱۶۳۲ء میں پشاور کے قریب ''بہادر کلے'' ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور رحمان بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام عبدالستار تھا جو مہمند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے گاؤں کے جید عالم دین ملا محمد یوسف سے حاصل کی۔ اس کے بعد کوہاٹ چلے گئے، جہاں آپ نے جذب وسلوک کی منزلیں طے کیں۔ جوانی ہی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اکثر عشق ربانی میں ڈوبے رہتے۔

رحمان بابا پشتو کے عظیم صاحب طرز شاعر ہیں جو دوسروں سے منفرد مکتبہ فکر کے حامل ہیں، جس میں خودی کی تعلیم اور عالمگیر انسانی مساوات کا درس دیا جاتا ہے۔ آپ کا پیغام محبت ہے۔ تمام انسانوں سے محبت، ساری کائنات سے محبت۔ اگر نفرت ہے تو ظلم سے، بے انصافی سے، استحصال سے، جبر وتشدد اور آمریت سے۔ یہی آپ کی صوفیانہ شاعری کی اساس ہے اور یہی آدرش ہے جو انھیں دوسرے پشتو شعرا سے ممیز کرتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کے ہاں اخلاقی پہلو غالب ہے لیکن ناصحانہ اسلوب کو بھی خشک اور ناگوار نہیں ہونے دیا۔

رحمان بابا بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل جس کومل لہجے، دھیمے سروں، نرم ونازک احساسات اور مترنم الفاظ کی متقاضی ہے وہ تمام خوبیاں ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

رضا ہمدانی نے آپ کلام کا منظوم ترجمہ کیا ہے جس میں سے دو اقتباسات شامل کتاب ہیں۔

عیب جوئی کی مذمّت

(۱)

عیب جوئی میں باہنر ہے تُو — اپنی لغزش سے بے خبر ہے تُو
ہے ملائک سے بڑھ کے تیرا مقام — بے عمل! کتنا کم نظر ہے تُو
نعمتوں کا کِیا نہ شکر کبھی — ملی زحمت تو محوِ شر ہے تُو
سفرِ حج تجھے گوارا نہیں — بہرِ زر عازمِ سفر ہے تُو
جس طرح کھوکھلا ہو نخلِ کُہن — عہدِ پیری میں بے ثمر ہے تُو
تیرا درماں ہے گفتۂ رحمٰن — کیوں زمانے میں دَر بدر ہے تُو

(۲)

ہے اتفاق کہ رُوئے رقیب کالا ہے — وگرنہ آئینۂ دل ہرا نہیں میلا
حلال خور وہ کہتے ہیں اپنے بھنگی کو — جو اچھے لوگ ہیں کہتے نہیں کسی کو برا
بری ہے یا کہ بھلی اپنی اپنی صورت ہے — ہر ایک چہرے کا ہے اپنا اپنا آئینہ
جو تُو نے بویا ہے کاٹے گا بھی وہی آخر — کہ جیسا تخم ہو، ویسا ہی پھل بھی پائے گا 6
ہو اپنے عیب پہ تیری نظر اگر رحمٰن
کبھی نہ پائے تو الزام عیب جوئی کا

سوالات

۱۔ رحمان بابا نے اپنی نظم کے پہلے بند میں عیب جوئی کی جو مذمت کی ہے، اسے اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
۲۔ انسان کا مقام و مرتبہ ملائک سے بڑھ کر کیسے ہوتا ہے؟
۳۔ رحمان بابا نے اپنی نظم کے دوسرے بند میں عیب جوئی کی مذمّت کن الفاظ میں کی ہے؟

مولانا ظفر علی خاں

ولادت: ۱۸۷۳ء **وفات: ۱۹۵۶ء**

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''مہرتھ'' میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی سراج الدین احمد تھا اور یہ کرم آباد (تحصیل وزیرآباد) سے ہفتہ وار اخبار ''زمیندار'' نکالتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ابتدائی تعلیم وزیرآباد سے حاصل کی اور میٹرک پٹیالہ سے پاس کیا۔ بعدازاں علی گڑھ کالج سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد مولانا ریاست جموں وکشمیر کے محکمۂ ڈاک میں ملازم بھرتی ہو گئے مگر جلد ہی یہ ملازمت ترک کر کے دوبارہ علی گڑھ کالج میں داخل ہو گئے اور بی اے تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو انھیں حیدرآباد میں ملازمت مل گئی مگر یہ ملازمت بھی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی اور ۱۹۰۹ء میں مولانا اپنے والد کی وفات کے بعد لاہور چلے آئے۔ لاہور آ کر مولانا نے زمیندار اخبار کی ادارت سنبھالنے کے ساتھ ہی اس کا دفتر بھی لاہور ہی میں منتقل کر لیا۔ مولانا نے ہفتہ وار زمیندار کو روزنامہ بنا کر اردو صحافت میں گراں قدر خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ مولانا قوم کے سچے اور مخلص خیرخواہ تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے قوم کو خوابِ غفلت سے جگا کر اس میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنے کی سعی کی۔

مولانا ظفر علی خاں ایک نڈر اور بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ایک بدیہہ گو شاعر بھی تھے۔ مولانا بہت خوش طبع اور بذلہ سنج تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا اور ایک ہی نشست میں کئی کئی نظمیں لکھ ڈالتے تھے۔ مولانا زبان و بیان اور فن کے اعتبار سے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ یوں تو مولانا نے کئی اصنافِ شعری میں طبع آزمائی کی مگر ان کا حمدیہ اور نعتیہ کلام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کی حمد میں ایک راسخ العقیدہ انسان کے دل سے نکلی ہوئی صدائیں ہیں۔ جن کے مضامین میں وسعت اور اندازِ بیان میں ندرت ہے۔ بے ساختہ پن ہی ان کے کلام کی خاص خوبی ہے اور یہ خوبی اُن کے ہاں حمد میں بھی ملتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص عقیدت و محبت تھی۔ مولانا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مدح میں کئی نعتیں لکھیں۔ ان کا نعتیہ کلام عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبے کی پاکیزگی اور خلوص و احترام سے بھرپور ہے۔

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم، خطیبانہ لہجہ، پرشکوہ الفاظ، زبان و بیان کی صفائی، جذبۂ حریت، طنز، مقصدیت اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کی مہارت ان کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کے شعری مجموعوں میں ''بہارستان''، ''نگارستان''، ''چمنستان'' اور ''حبسیات'' وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

حمد

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تُو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تُو نے

تری صنعت کے ڈھانچے میں ڈھلا ہے پیکرِ ہستی
سمویا اپنے ہاتھوں سے مزاجِ جسم و جاں تُو نے

نہیں موقوف خلاقی تری اس ایک دُنیا پر
کیے ہیں ایسے ایسے سیکڑوں پیدا جہاں تُو نے

کسی کو تاکہ اپنی سر بلندی پر نہ غرّہ ہو
ازل سے کی نگوں ساری نصیبِ آسماں تُو نے

دلوں کو معرفت کے نور سے تُو نے کیا روشن
دکھایا بے نشاں ہو کر ہمیں اپنا نشاں تُو نے

اثر تیری عطاؤں پر نہیں پڑتا خطاؤں کا
جسے پیدا کیا اس کو دیا ہے آب و ناں تُو نے

مئے لا تقنطوا کے نشّہ میں سرشار رہتا ہوں
سیہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تُو نے

سوالات

۱۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) یہ کس شاعر کا شعر ہے؟

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تُو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تُو نے

(الف) بہادر شاہ ظفر کا (ب) سراج الدین ظفر کا (ج) احمد ظفر کا (د) ظفر علی خاں

(ii) ظفر علی خاں کی بالعموم وجۂ شہرت حمد کے علاوہ اور کون سی صنفِ شاعری ہے؟

(الف) مثنوی (ب) نعت (ج) مرثیہ (د) ڈراما

۲۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) مطلع کسے کہتے ہیں؟

(ii) اس حمد کا مطلع لکھیے۔

(iii) ردیف کسے کہتے ہیں؟

(iv) اس حمد میں ردیف کیا ہے؟

(v) لَا تَقْنَطُوا کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ ان تراکیب کی وضاحت کیجیے:

پیکرِ ہستی ، مزاجِ جسم و جاں ، نصیبِ آسماں، مے لَاتَقْنَطُوا، حیاتِ جاوداں

۴۔ مولانا ظفر علی خاں کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔

۵۔ مولانا ظفر علی خاں کی حمدیہ شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۶۔ اس ''حمد'' میں جن تلمیحات کا ذکر ہے ان کی وضاحت کیجیے۔

۷۔ خالی جگہ پر کر کے مصرعے مکمل کیجیے:

(i) دکھائے اپنی..................کے ہیں کیا کیا نشاں تُو نے

(ii) سمویا اپنے..................سے مزاجِ جسم و جاں تُو نے

(iii) ازل سے کی نگوں ساری نصیب..................تُو نے

(iv) جسے پیدا کیا اس کو دیا ہے آب و..................تُو نے

۸۔ اس شعر کی تشریح کیجیے:

مئے لَاتَقْنَطُوا کے نشہ میں سرشار رہتا ہوں
یہ مستوں کو بخشی ہے حیاتِ جاوداں تو نے

محسن کاکوروی

ولادت: ۱۸۲۷ء　　　　　　　　　　وفات: ۱۹۰۵ء

نام محمد محسن اور تخلص بھی محسن ہی تھا۔ یہ ۱۸۲۷ء میں ''کاکوری''، ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے کاکوروی کہلائے۔ محسن کے آباء واجداد ارضِ مقدس حجاز کے رہنے والے تھے جو مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آخر میں لکھنؤ آ کر آباد ہو گئے۔ محسن کے والد کا نام مولوی حسن بخش تھا جو اس وقت کے ممتاز عالم دین تھے۔ انھوں نے احوال انبیا علیھم السلام کے حوالے سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم تک مفصل حالات قلمبند ہیں۔

محمد محسن کاکوروی نے سات برس کی عمر سے اپنے جد بزرگوار مولوی حسین بخش شہید کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ محسن بچپن ہی سے مذہب سے بہت لگاؤ رکھتے تھے۔ رات کے پچھلے پہر اٹھ کر نماز تہجد ادا کرنا اور تلاوت قرآن مجید کے بعد درود شریف کا ورد کرنا ان کا معمول تھا۔ روایت ہے کہ محسن ابھی نو برس ہی کے تھے کہ انھیں خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس مبارک خواب کا حال محسن نے فارسی میں نظم کیا تھا اور محسن اس بارے میں خود کہتے ہیں کہ یہ ان کی سب سے پہلی نظم تھی جو اس متبرک خواب کی خوشی میں میں نے لکھی تھی۔ محسن ۲۴۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں اس عالمِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

محمد محسن کاکوروی کی شاعری زبان و بیان کے لحاظ سے فنی محاسن کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے کلام میں عربی، فارسی اور ہندی زبان کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جن کا استعمال محسن نے بڑی فنی چابک دستی سے کیا ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست، روانی، صفائی اور فنی مہارت ان کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔

محمد محسن کاکوروی کا زیادہ تر کلام نعتوں پر مشتمل ہے۔ ان کی وجہ شہرت بھی ان کا نعتیہ کلام ہی ہے۔ ان کا نعتیہ کلام ان کے صاحبزادوں مولوی محمد نور الحسن نیر (مولف نور اللغات) اور مولوی محمد انوار الحسن نے محفوظ کر لیا تھا جسے اوّل الذکر نے ''کلیاتِ نعتِ محسن'' کے نام سے مرتب کیا اور اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے پہلی بار شایع کیا۔ اس مجموعہ کلام میں نعتوں کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ کے مناقب بھی موجود ہیں اور چند دیگر شعری اصناف بھی شامل ہیں۔

نعت

کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلا بادل
سجدے کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل

بحرِ امکاں میں رسولؐ عربی دُرِّ یتیم
رحمتِ خاص خداوندِ تعالیٰ بادل

قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضورؐ
موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے کالا بادل

دور پہونچی لبِ جاں بخشِ نبیؐ کی شہرت
سن ذرا کہتے ہیں کیا حضرتِ عیسیٰؑ بادل

چشمِ انصاف سے دیکھ آپؐ کے دندانِ شریف
دُرِّ یکتا ہے ترا گرچہ یگانا بادل

تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر
شبِ معراج میں تھا عرشِ معلیٰ بادل

آمد و رفت میں تھا ہم قدمِ برق براق
مرغزارِ چمن عالمِ بالا بادل

ہفت اقلیم میں اس دیں کا بجایا ڈنکا
تھا تری عام رسالت کا گرجتا بادل

دینِ اسلام تری تیغ دودم سے چمکا
یا اٹھا قبلے سے دیتا ہوا کاندھا بادل

آستانے کا ترے دہر میں وہ رُتبا ہے
کہ جو نکلا تو جھکائے ہوئے کاندھا بادل

تیغ میدانِ شجاعت میں چمکتی بجلی
ہاتھ گلزارِ سخاوت میں چمکتا بادل

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے۔

(الف) اس نعت کی ردیف کیا ہے؟

(ب) قافیہ کسے کہتے ہیں؟

(ج) نعت میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

۲۔ مندرجہ ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے۔

ہفت اقلیم، دراقدس، قبلۂ اہلِ نظر

۳۔ محسن کاکوروی کے مختصر حالاتِ زندگی لکھیے۔

۴۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۵۔ مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر
شبِ معراج میں تھا عرشِ معلّیٰ بادل

۶۔ خالی جگہ پُر کیجیے۔

(i) آمدو.................. میں تھا ہم قدم برق براق

(ii) مرغزارِ چمن عالمِ بالا.........................

۷۔ اس نعت میں رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے جن پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے، انھیں اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

مثنوی

مثنوی کا لفظ ''مثنیٰ'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ''دو دو'' ہیں۔ یہ وہ صنفِ سخن ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہوتے ہیں۔ قصیدے اور غزل کے برعکس اس میں ہر شعر کے بعد قافیہ اور ردیف بدل جاتی ہے۔

مثنوی عام طور پر قصوں، داستانوں اور جنگوں کے واقعات وغیرہ کو منظوم صورت میں پیش کرنے کے کام آتی ہے۔ اس میں اپنی کشادہ دامانی کے باعث ہر قسم کے مضامین کو اپنے اندر سمانے اور سمونے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے لیے بحریں مخصوص اور عام طور پر مختصر ہوتی ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح بعض دیگر اصناف سخن کا آغاز دکن میں ہوا، اسی طرح سب سے پہلی مثنوی بھی دکن کی سرزمین میں لکھی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ہر طرف تصوف کا رنگ عام تھا۔ اکثر شعرا، صوفیانہ اخلاقی مضامین و موضوعات کے اظہار کے لیے مثنوی کی صنف اختیار کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس دور میں جو مثنویاں وجود میں آئیں، ان میں سنسکرت اور فارسی کے تراجم عام تھے۔ اس سلسلے میں نظامی دکنی کو سب سے پہلا مثنوی نگار قرار دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے دو سال کی مدت میں اپنی مثنوی ''پدم راؤ قدم راؤ'' لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد دکن میں کئی مثنوی نگار پیدا ہو گئے۔

دکن کے بعد برصغیر پاک و ہند کے شمالی علاقے میں بھی بہت سے مثنوی نگار سامنے آئے۔ ان شاعروں کی مثنویاں زیادہ تر طبع زاد ہیں۔ ان مثنوی نگاروں میں میر تقی میر، خواجہ میر اثر، جرأت، مصحفی، میر حسن، نسیم لکھنوی، مومن، واجد علی شاہ اور مرزا شوق کے نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان شاعروں میں سے اکثر کی مثنویاں زیادہ طویل نہیں ہیں۔ لیکن ان شاعروں کے اساتذۂ فن ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر مثنویوں کو بہت شہرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں میر تقی میر کی مثنویوں میں سے ''شعلۂ عشق'' اور ''دریائے عشق'' کے علاوہ خواجہ میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کا ذکر ضروری ہے۔ ان مثنویوں کی سب سے زیادہ نمایاں خوبی زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی ہے۔ لیکن اس صنفِ سخن کے سلسلے میں جو شہرت میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' اور نسیم لکھنوی کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کو حاصل ہے، وہ دوسروں کے حصے میں کم آئی ہے۔ البتہ اس دور میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں ''زہرِ عشق''، ''بہار عشق'' اور ''فریب عشق'' کی شہرت و مقبولیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بعد کے دور میں مولانا حالی اور مولانا آزاد نے بھی بعض معاشرتی مسائل اور مناظرِ فطرت پر مثنویاں لکھیں جن کو قبول عامہ کی سند ملی۔ اس سلسلے میں حالی کی مثنویوں ''مناجات بیوہ'' اور ''نشاطِ امید'' اور آزاد کی ''صبح امید'' اور زمستاں'' کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ شعرا کے علاوہ اردو میں جن لوگوں نے مثنوی لکھی ہے، ان میں حفیظ جالندھری کی مثنوی ''شاہنامۂ اسلام'' بہت طویل ہے اور اس کا موضوع تاریخ اسلام ہے۔ چونکہ طویل مثنوی لکھنے اور پڑھنے کے لیے فرصت درکار ہے جو موجودہ سائنسی دور میں بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے، اس لیے عام طور پر طویل مثنویوں کا مستقبل محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

بعض دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا قصہ یا موضوع مربوط اور مسلسل ہوتا ہے۔ اس کا مضمون یا موضوع غیر فطری نہ ہو اور مبالغہ آمیزی سے بھی پاک ہو تو یہ صنف بھی کسی دیگر اصناف سخن سے کم دل چسپ نہیں ہے۔ آج کل اردو شاعری میں مثنوی نگاری کا رواج پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہو چکا ہے۔

میر حسن

ولادت: ۱۷۳۶ء وفات: ۱۷۸۶ء

نام میر غلام حسن اور تخلص بھی حسن ہی تھا۔ میر حسن ۱۷۳۶ء میں دتی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔ میر حسن مشہور ہجو گو میر ضاحک کے بیٹے، میر خلیق کے والد اور نامور مرثیہ گو میر انیس کے دادا تھے۔ میر حسن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد میر ضاحک سے حاصل کی تھی۔ پھر دتی جب تاراج ہوئی تو میر حسن اپنے والد کے ہمراہ فیض آباد چلے گئے جو اس زمانے میں اودھ کا دارالحکومت تھا۔ یہاں آ کر وہ نواب سالار جنگ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ ۱۷۷۵ء میں جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو یہ بھی لکھنؤ چلے آئے۔ ۱۸۸۶ء میں لکھنؤ ہی میں میر حسن کا انتقال ہوا۔

میر حسن میں شاعری کا ملکہ موروثی تھا اور ابتدا میں انھوں نے شعر و سخن کی اصلاح اپنے والد ہی سے لی تھی۔ پھر خواجہ میر درد اور ضیا الدین ضیا سے بھی اصلاح سخن لیتے رہے۔

میر حسن صاحب دیوان شاعر تھے۔ میر حسن کی شہرت ان کی غزلیات یا قصائد نہیں بلکہ ان کی شاہکار مثنوی سحر البیان ہے۔ مثنوی نگاری میں میر حسن کو کمال حاصل تھا۔ سحر البیان ایک منظوم داستان ہے جو اپنے نام کی طرح واقعی زبان و بیان کا سحر ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر مصحفی نے انھیں ''شاعر شیریں بیان'' کہا تھا۔ سحر البیان اگرچہ لکھنؤ میں لکھی گئی تھی مگر زبان و بیان کی سادگی و سلاست اور روزمرہ محاورے کے اعتبار سے یہ مثنوی دبستان دتی کی نمائندہ مثنوی بن گئی۔ سحر البیان میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ گو کہ اس مثنوی کا قصہ روایتی داستانوں جیسا ہے مگر زبان و بیان کی خوبی نے اس کے کئی اشعار کو ضرب المثل بنا دیا ہے۔

سحر البیان اپنے عہد کی آئینہ دار مثنوی ہے۔ اس میں اس زمانے کے رسوم و رواج، تہذیب و تمدن اور درباری شان و شوکت کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

سحر البیان دلکش زبان و بیان، روزمرہ محاورہ، صفائی و شگفتگی، سادگی و بے تکلفی، روانی و بے ساختگی، ربط و تسلسل، جزئیات نگاری، منظر نگاری، واقعہ نگاری، جذبات نگاری اور شیریں بیانی کا حسین مرقع ہے۔

داستان تیاری میں باغ کی

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ[1] پہ خوبی سے لٹکا ہوا

وہ مقیش[2] کی ڈوریاں سربسر
کہ مہ کا بندھا جس میں تارِنظر

چھتوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گزرنا محال

سنہری مغرّق[3] چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گلکاریاں

دیے ہر طرف آئینے جو لگا
گیا چوگنا لطف اس میں سما

وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

---

1 ڈوری 2 سونے چاندی کے تاروں کا بنا ہوا کپڑا 3 جگمگاتی ہوئی

رہیں لخلخے[1] اس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس سے مشام

چھپرکھٹ مرصّع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمیں کا کروں واں کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگِ مرمر کی چوپڑ[2] کی نہر
گئی چارسُو اس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اس کے سرو سہی
کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیتِ داربست[3]
لگائے رہیں تاک واں مے پرست

زمرّد کی مانند سبزے کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار
گلِ اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ ، گل سے چمن
کہیں نرگس و گل ، کہیں یاسمن

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

---

1. خوشبودار چیزیں 2. چارشاخوں میں تقسیم 3. انگور وغیرہ کی بیل چڑھانے کی جگہ

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) مثنوی کسے کہتے ہیں؟

(ii) دو اہم مثنوی نگاروں کے نام لکھیے۔

(iii) میر حسن کی مشہور مثنوی کا نام کیا ہے؟

۲۔ میر حسن کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ میر حسن کی مثنوی نگاری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۴۔ میر حسن کی منظر نگاری پر مختصر نوٹ لکھیے۔

۵۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

چمن سے بھرا باغ، گل سے چمن
کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمن
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

۶۔ ان تراکیب کا مطلب لکھیے:

آتشِ گل، خانہ باغ، تارِ نظر، دست بستہ

۷۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کیجیے:

مغرق، مرصع، رشک، زربفت، داربست

۸۔ خالی جگہ پُر کرکے مصرعے مکمل کیجیے:

(i) عمارت کی خوبی دروں کی وہ ....

(ii) دروں پر کھڑی دست بستہ..................

(iii) وہ .... کا فرش اس کا ستھرا کہ بس

(iv) ہوا کے سبب .... مہکا ہوا

دیا شنکر نسیم

ولادت:۱۸۱۲ء　　　　　　　　　　　　　　　　وفات:۱۸۴۴ء

نام دیا شنکر اور تخلص نسیم تھا۔نسیم ۱۸۱۲ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق کشمیر کے کول پنڈتوں سے تھا۔ان کے والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔نسیم کا خاندان شعر وادب سے خاص شغف رکھتا تھا۔ہندو ہونے کے باوجود نسیم نے مروجہ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔نسیم کو اسلامی اقدار سے بھی آگاہی تھی۔تعلیم سے فراغت کے بعد نسیم نے فوج میں ملازمت کر لی تھی۔نسیم ۳۲ سال کی عمر میں ہی انتقال کر گئے تھے۔

نسیم کو شعر وشاعری سے فطری لگاؤ تھا۔وہ بے حد ذہین وطباع اور بذلہ سنج تھے۔انھوں نے اصلاح سخن کے ضمن میں آتش کی شاگردی اختیار کی تھی۔انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی مگر ان کی شہرت کا باعث ان کی مثنوی ''گلزار نسیم'' ہے۔گلزار نسیم نہ صرف نسیم کا کارنامہ ہے بلکہ دبستان لکھنؤ کی نمائندہ مثنوی بھی ہے۔اس مثنوی کا اپنا ایک منفرد اور جداگانہ رنگ ہے۔مثنوی گلزار نسیم میں اس عہد کا لکھنؤ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

گلزار نسیم صنعت گری اور مرصع نگاری کا بہترین مرقع ہے۔فصاحت کے ساتھ ساتھ گلزار نسیم بلاغت واختصار کی بھی عمدہ مثال ہے۔اس مثنوی میں اختصار اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے۔مثنوی میں تاج الملوک اور گل بکاؤلی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔گلزار نسیم کا ایک ایک شعر فنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔گلزار نسیم کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نسیم نے اس مثنوی پر اس قدر محنت کی کہ وہ علیل ہو گئے اور بالآخر اپنی جان ہار گئے۔

گلزار نسیم ایجاز واختصار، لفظی آرائش، مبالغہ آرائی، رعایت لفظی، نادر تشبیہات واستعارات، منظر نگاری، مرصع کاری، اسلامی اثرات، جامعیت اور لکھنوی تہذیب وتمدن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

داستان تاج الملوک شہزادے

اور

زین الملوک بادشاہ مشرق کی

پورب میں ایک تھا شہنشاہ
سلطان زین الملوک ذی جاہ

لشکر کش و تاج دار تھا وہ
دشمن کش و شہریار تھا وہ

خالق نے دیے تھے چار فرزند
دانا، عاقل، ذکی، خردمند

نقشہ ایک اور نے جمایا
پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا

وہ نور کہ صدقے مہرِ انور
وہ رخ کہ نہ ٹھہرے۔ آنکھ جس پر

نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو
چشمک تھی نصیب اس پدر کو

خوش ہوتے ہی طفلِ مہ جبیں سے
ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

پردے سے نہ دایہ نے نکالا
پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

تھا افسرِ خسرواں وہ گل فام
پالا تاج الملوک رکھ نام

جب نامِ خدا جواں ہوا وہ
مانندِ نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی
بینائی کے چہرے پر نظر کی

مہرِ لب شہ ہوئی خموشی
کی نورِ بصر سے چشم پوشی

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور
خارج ہوا نورِ دیدۂ کور

آیا کوئی لے کے نسخۂ نور
لایا کوئی جا کے سرمۂ طور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور
بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے
مختار ہے جس طرح بنا ہے

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیں:

(i) مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گلزارنسیم کن شعرا کی تخلیقات ہیں؟

(ii) دیا شنکرنسیم کی مشہور مثنوی کا نام کیا ہے؟

(iii) مثنوی ''گلزارنسیم'' میں کس شہزادے کی داستاں ہے؟

(vi) بادشاہِ مشرق کا کیا نام تھا؟

۲۔ دیا شنکرنسیم کے حالات زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ دیا شنکرنسیم کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۴۔ ان تراکیب کا مطلب لکھیے:

دشمن کُش، مہرِ انور، طِفل مہ جبیں، افسرِ خسرواں، نورِ دیدۂ کور

۵۔ ان اشعار کا مطلب لکھیے:

لشکر کش و تاج دار تھا وہ
دشمن کش و شہر یار تھا وہ
خالق نے دیئے تھے چار فرزند
دانا، عاقل، ذکی، خرد مند

۶۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کیجیے:

خالق، خردمند، پدر، طفل، خارج

۷۔ صحیح بیان کے سامنے (✓) اور غلط کے سامنے (×) کا نشان لگایے:

(i) دیا شنکرنسیم کی مشہور مثنوی کا نام گلزارنسیم ہے۔

(ii) گلزارِنسیم میں دہلوی تہذیب وتمدن کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

(iii) دیا شنکرنسیم کا تعلق دہلی سے تھا۔

(iv) گلزارِنسیم کی خاص خوبی ایجاز واختصار ہے۔

۸۔ مثنوی ''گلزارنسیم'' کے شامل کتاب حصے میں رعایتِ لفظی، تشبیہات اور منظرنگاری کی جو خوبیاں سامنے آئی ہیں، انھیں بیان کریں۔

غزل

ناقدینِ شعروسخن کی اکثریت نے آج تک غزل کی تعریف کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کے مطابق غزل کا معنیٰ ہے:

عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ تعریف یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ غزال (ہرن) شکاری کے تیر سے یا شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر مایوسی کے عالم میں جو دردناک آواز نکالتا ہے، وہ غزل ہے۔

غزل کا لفظ عربی زبان کا ایک مصدر ہے جس کا معنیٰ ''کاتنا'' ہے، اسی سے ''مِغزَل'' ماخوذ ہے جو چرخے یا تکلے کو کہتے ہیں۔

ادب کی بعض اصطلاحات مثلاً شعر اور نظم کے معانی بھی قابل غور ہیں۔ شعر کا معنیٰ ''گوندھنا'' اور نظم کا مطلب ''پرونا'' ہے۔ اس اعتبار سے غزل، شعر اور نظم ایسے الفاظ ہیں جو ایک خاص قسم کے ضبط، ترتیب اور سلیقے کا اظہار کرتے ہیں۔

ان تعریفوں کے پس منظر میں جو حقائق یا مسلّمات آشکار ہوتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

- ☆ غزل کی زبان، اس کا لہجہ اور اندازِ بیان اسی طرح شائستہ، نرم اور لطیف ہونا چاہیے جس طرح ایک مہذب معاشرے میں عورتوں سے گفتگو کے وقت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔
- ☆ غزل کے استعارات، تشبیہات، کنایات، علامات وغیرہ دنیائے حُسن وعشق سے حاصل کیے جائیں تاکہ بیان میں لطافت اور دلبری قائم رہے۔
- ☆ مجموعی طور پر غزل میں سوز و گداز اس کا ایک لازمہ ہے۔

یہ تعریفات اور حقائق آج بھی متفق علیہ ہیں اور بہت حد تک اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن غزل کی جامعیت اور ہمہ گیری ان ''حدود'' کو اکثر پھاندگئی ہے تاہم اس نے اپنے مزاج کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب غزل میں عشق ومحبت کے جذبات کے علاوہ اخلاق، تصوف، فلسفہ بلکہ دین وسیاست تک کے موضوعات سامنے آئے ہیں تو بھی غزل کا شعر غزل ہی کا شعر محسوس ہوا ہے اور نظم سے بالکل الگ اور نمایاں نظر آیا ہے۔

جہاں تک غزل کی ہیئت یا صورت کا تعلق ہے، اگرچہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو غزل نے صدیوں کا سفر طے کیا ہے لیکن آج بھی اس کا قالب یا سانچہ وہی ہے جو روزِ اول اس کے لیے تیار ہو گیا تھا البتہ معنوی طور پر غزل بہت حد تک بدل سکتی ہے اور وہ بدل چکی ہے۔ اس طرح اس نے اپنے دامن کو بہت زیادہ کشادہ کر لیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ غالب جیسے عظیم اور منفرد شاعر کو غزل کی تنگ دامانی کی شکایت تھی اور اس نے کہا تھا کہ:

بقدر ذوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

آج یہ زمانہ ہے کہ غزل میں ہر قسم کے افکار و خیالات اور مشاہدات و تجربات کو سمونے اور سمانے کی گنجائش موجود ہے۔ یہ گنجائش اور کشادہ دامانی بجا لیکن جہاں غزل کا مزاج نظر انداز کر دیا جائے، وہاں یہ چیز کچھ غیر مانوس صورت ضرور پیدا کر دیتی ہے۔

غزل آج ایک بالکل جدا اور الگ صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ لیکن ایک زمانے میں وہ قصیدے کا ایک حصہ تھی۔ اس رائے یا خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ قصیدے اور غزل دونوں کا مزاج اور ہیئت ایک سی ہے۔

قصیدے کا پہلا شعر بالکل غزل ہی کی طرح ہوتا ہے۔ دونوں مصرعوں میں قافیوں اور ردیف کا اہتمام اور غزل غیر مردف ہو تو دونوں مصرعوں میں قافیوں کا اہتمام پھر بھی ضروری ہوگا۔ غزل کے اس پہلے شعر کو ''مطلع'' کہا جاتا ہے اور غزل کے آخری شعر کو، جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، ''مقطع'' کہتے ہیں۔

باقی اشعار میں قصیدہ اور غزل آپس میں بالکل ملتے جلتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ مطلب کا حامل ہوتا ہے اور قصیدے میں حصہ وار تشبیب، گریز، مدح، طلب، دعا یا مذمت وغیرہ ہوتے ہیں۔

جس طرح قصیدے کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں، اسی طرح غزل کے اشعار کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ غزل کے اشعار کی تعداد قصیدے کے مقابلے میں کافی کم ہوتی ہے۔

غزل شروع شروع میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، الگ صنفِ سخن نہیں تھی نیز اس کے اشعار معنوی اعتبار سے کسی ایک مربوط موضوع پر نہیں ہوتے، اس لیے اس کی اس ''پریشان خیالی'' کے باعث اس پر اعتراضات بھی بہت کیے گئے لیکن دیکھا جائے تو یہی ''پریشاں خیالی'' غزل کی انفرادیت اور خوبی بھی ہے کہ اس طرح اس کا ہر شعر خیال یا تخیل کی اپنی ایک الگ دنیا میں لے جاتا ہے۔

مختلف زمانوں میں غزل پر بہت سخت وار کیے گئے اور اس کا وجود مٹا دینے کے لیے زور لگایا گیا لیکن یہ اس قدر سخت جان صنف ثابت ہو چکی ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی مقبولیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی فرق نہیں آیا بلکہ یہ روز بروز شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کرتی جا رہی ہے۔

غزل کا بہترین دَور میر اور غالب کا دَور تھا۔ اس دَور میں اور بھی بہت سے ممتاز غزل گو پیدا ہوئے۔ حالی کا زمانہ آیا تو غزل کا مزاج ہی بدل گیا، اس مزاج کے زیرِ نظر اقبال کی غزل بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ ہاں البتہ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو مر مر کے جی اٹھتی ہے۔ اس نے اقبال کے بعد بھی آج تک بے شمار غزل گو پیدا کیے ہیں۔ نامور غزل گو شعرا میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، غلام ہمدانی مصحفی، خواجہ حیدر علی آتش، میر انشاء اللہ خاں انشا، میرزا اسد اللہ غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم مومن خان مومن، مولانا الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی، اقبال اور ان کے بعد کے متعدد غزل گو شعرا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ولی دکنی

ولادت:۱۶۶۸ء　　　　وفات:۱۷۴۴ء

ولی دکنی ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ولی کے اصل نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اکثریت کے مطابق ان کا نام محمد ولی یا شاہ ولی اللہ ہے۔ ولؔی ان کا تخلص ہے اور ولی دکنی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ مگر ادبی دنیا میں انھیں ولی گجراتی، ولی احمد آبادی اور ولی اورنگ آبادی بھی کہا جاتا ہے۔ ولی نے تقریباً بیس برس تک اورنگ آباد میں ہی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ مزید تعلیم کے لیے احمد آباد چلے گئے جو اس زمانے میں علوم وفنون کا محور ومرکز تھا۔ یہاں آکر شاہ وجیہہ الدین علوی کے مدرسہ میں داخل ہوگئے۔ تحصیل علم کے بعد وطن واپس آکر مشقِ شعر وسخن میں محو ہوگئے۔ ولی نے ۱۷۴۴ء میں وفات پائی اور احمد آباد میں دفن ہوئے۔

ولی دکنی کو ریختہ کا مُوجد، اردو کا چاسر اور غزل کا ''باوا آدم'' بھی کہا جاتا ہے۔ ولی صوفی منش انسان اور خانقاہ نشین تھے۔ تصوف سے لگاؤ کی بنا پر ہی ولی نے پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں دلّی کا سفر اختیار کیا تھا۔ یہاں آکر ولی کی ملاقات میاں سعد اللہ گلشن سے ہوئی جو فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ ولی نے سعد اللہ گلشن سے متاثر ہوکر انھیں اپنا کلام سنایا تو شاہ صاحب نے ولی کو صلاح دی کہ ''یہ سب مضامین جو فارسی میں بے کار پڑے ہیں، ان کو ریختہ میں شاہ جہاں آباد کے محاورے کے مطابق کام میں لاؤ۔''

ولی دکنی کو سعد اللہ گلشن کا یہ مشورہ بہت بھایا اور انھوں نے اپنی شاعری کو، جو کہ اک خاص علاقے تک ہی محدود تھی، مقامی حیثیت سے آگے بڑھا کر اس میں وسعت واضافے کیے۔ ۱۷۲۰ء میں جب ولی کا دیوان دلّی پہنچا تو اسے بے حد پذیرائی ملی اور یہی شمالی ہند کے تمام شعرا کے لیے نمونہ بنا۔

ولؔی نے مثنوی، قطعہ، رباعی، مستزاد اور ترجیع بند وغیرہ میں طبع آزمائی کی لیکن غزل ہی ان کی خاص پہچان بنی۔ ولی نے موضوعات کے تنوع، افکار کی رنگارنگی اور اپنے عہد کے شعری ولسانی محاسن کو قابل فہم بنا کر اردو شاعری کے دامن کو وسعت بخشی۔

ولی کا کلام سادہ، صاف اور فصیح ہے۔ سلاست وسادگی، صفائی وروانی، اثر آفرینی، نشاطیہ پہلو اور جمال پرستی ولی کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ ولی کا مجموعہ کلام خاصا ضخیم ہے اور متعدد بار شائع ہوچکا ہے۔

(۱)

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی
یو کشورِ ایراں میں سلیماںؑ سوں کہوں گا

مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلیٰ خوباں!
مجنوں ہوں! ترے غم کو بیاباں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایہ خوبی!
اس خواب کو جا یوسفؑ کنعاں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولیؔ اس درد سوں ہر گز
جلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

(۲)

پھر میری خبر لینے وو صیاد نہ آیا — شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا
مدت ستی مشتاق ہیں عشاق جفا کے — بے داد کہ وہ ظالم بے داد نہ آیا
جاری کیا ہوں جوئے رواں اشکِ رواں سوں — افسوس کہ وہ غیرتِ شمشاد نہ آیا
جس غم منیں موزوں کیا ہوں آہ کا مصرع — وہ مصرع دل چسپ پری زاد نہ آیا

پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریاد ولیؔ کی
لیکن وہ صنم سننے کوں فریاد نہ آیا

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) ولی دکنی کا تعلق کس شہر سے تھا؟

(ii) غزل کا باوا آدم کسے کہا جاتا ہے؟

(iii) مقطع کسے کہتے ہیں؟

(iv) ولی دکنی کی پہلی غزل میں کون سی ردیف استعمال ہوئی ہے؟

(v) ولی دکنی کی دوسری غزل میں کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟

(vi) ولی کی پہلی غزل میں کون کون سی تلمیحات استعمال ہوئیں ہیں؟

۲۔ ولی دکنی کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ ولی دکنی کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۴۔ (الف) اعراب لگا کر تلفظ کی وضاحت کیجیے:

عشاق، اشک، بادشہی، کشورایراں

(ب) مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کیجیے:

اشکِ رواں، لعلِ بدخشاں، یوسفِؑ کنعاں، غیرتِ شمشاد

۵۔ خالی جگہ پُر کر کے مصرعے مکمل کیجیے:

(i) پھر میری.................. لینے وہ صیاد نہ آیا

(ii) مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلیٰ خوباں!

(iii) جلتا ہوں ترے درد میں درماں سوں کہوں گا

(iv) شاید کہ مرا.................. اسے یاد نہ آیا

۶۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(i) یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

(ii) دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایہ خوبی!
اس خواب کو جا یوسفؑ کنعاں سوں کہوں گا

خواجہ میر درؔد

ولادت: ۱۷۲۰ء وفات: ۱۷۸۵ء

نام خواجہ میر اور تخلص درؔد تھا۔ درؔد ۱۷۲۰ء میں دلّی میں پیدا ہوئے ان کے والد خواجہ محمد ناصر بھی صاحب دیوان شاعر تھے اور عندلیبؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان ''نالۂ عندلیب'' کے نام سے مشہور ہے۔ درؔد کے آباء واجداد کا تعلق بخارا سے تھا۔ درد کے والد شاہی منصب دار تھے مگر اپنی درویشانہ طبع کی بنا پر دنیاداری ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ چنانچہ شاعری اور تصوف درؔد کو ورثے میں ملا تھا۔ درؔد نے صرف گیارہ برس کی عمر میں قرآن وحدیث کے علاوہ فقہ اور تصوف کی تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔ درؔد کا خاندان پیری مریدی کے لئے مشہور تھا۔ درؔد ابھی ۲۹ برس ہی کے تھے کہ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے گدی نشین ہو گئے۔ زہد وتقویٰ اور توکل واستغنا درؔد میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دلّی تاراج ہوئی تو اکثر شعرا دلّی سے لکھنؤ ہجرت کر گئے۔ مگر درؔد اللہ پر توکل کیے دلّی سے باہر نہ نکلے۔ درؔد زندگی کے آخری لمحات تک دلّی ہی میں مقیم رہے اور ۱۷۸۵ء میں درد کا انتقال دلی ہی میں ہوا۔

درؔد کا سارا دیوان سراپا انتخاب ہے۔ درؔد نے جتنا بھی لکھا اس کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا اور تمام کم درجہ اشعار قلم زد کر دیے۔ درؔد کی شاعری صوفیانہ رنگ میں رچی ہوئی ہے۔ اخلاقیات، سلوک ومعرفت کے حقائق، صبر، توکل، استقامت، فنا، تصوف جیسے موضوعات درؔد کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ درؔد کی شاعری میں عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی کے اشعار بھی موجود ہیں۔ گویا ان کا کلام تصوف اور تغزل کا بہترین امتزاج ہے۔ سادگی وسلاست، اثر آفرینی، سوز وگداز، نفاست وصفائی، صداقت وخلوص، نغمگی وموسیقیت درؔد کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۱)

دنیا میں کون کون نہ یک بار ہو گیا
پر منہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے ، جو گیا

پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لیے
اے چشمِ اشکبار یہ کیا تجھ کو ہو گیا

برہم کہیں نہ ہو گل و بلبل کی آشتی
ڈرتا ہوں آج باغ میں وہ تند خو گیا

پھُولے گا اس زباں میں بھی گلزارِ معرفت
یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر
میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

اے دردؔ جس کی آنکھ کھُلی اس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو اپنی، وہ رو گیا

(۲)

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہو گا
کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہو گا

اُن نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا گر سنا ہو گا

دیکھیے غم سے اب کے جی میرا
نہ بچے گا بچے گا کیا ہو گا

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہو گا کہ رہ گیا ہو گا

حال مجھ غم زدے کا جس تس نے
جب سنا ہو گا رو دیا ہو گا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہو گا

یک بیک نام لے اٹھا میرا
جی میں کیا اس کے آ گیا ہو گا

سوالات

۱۔ خواجہ میر درد کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔
۲۔ خواجہ میر درد کی شاعری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
۳۔ اشعار کی تشریح کیجیے:
(الف) آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا
(ب) دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں کہیں غنچہ کوئی کھلا ہو گا
۴۔ ان تراکیب کا مطلب لکھیے:
چشمِ اشک بار، گلزارِ معرفت، مزاجِ دہر، گرم و سردِ زمانہ
۵۔ خالی جگہ پُر کر کے مصرعے مکمل کیجیے:
(i) ....کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا (ii) آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ..................
(iii) دل کے پھر زخم...............ہوتے ہیں (iv) کہیں ....کوئی کھلا ہو گا
۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:
(i) خواجہ میر درد کی وجہِ شہرت کیا ہے؟
(الف) غزل (ب) مثنوی (ج) مرثیہ
(ii) خواجہ میر درد کی شاعری کا اہم موضوع کیا ہے؟
(الف) مزاح (ب) تصوف (ج) منظر نگاری
(iii) خواجہ میر درد کا تعلق کس شہر سے تھا؟
(الف) لکھنؤ (ب) آگرہ (ج) دہلی

میر تقی میر

ولادت: ۱۷۲۳ء　　　　وفات: ۱۸۱۰ء

نام میر تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ میر ۱۷۲۳ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباو اجداد حجاز کے باشندے تھے۔ میر کے والد کا نام محمد علی تھا مگر زہد و تقویٰ کے باعث علی متقی کے نام سے مشہور ہوئے۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم سیّد امان اللہ سے حاصل کی۔ ان کی وفات کے بعد میرؔ کے والد نے خود ان کی تعلیم و تربیت کی مگر کچھ عرصے بعد وہ بھی وفات پا گئے اور یوں میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا اک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

میرؔ آغاز جوانی ہی میں دلّی آ گئے تھے اور پھر دلّی ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کو شعر و سخن سے فطری مناسبت تھی اور اس ضمن میں انھوں نے سراج الدین خان آرزو سے اصلاح لی۔ خان آرزو اپنے عہد کے نامور شاعر اور میرؔ کے سوتیلے ماموں بھی تھے۔ میر کچھ عرصہ ان ہی کے ہاں مقیم رہے مگر سوتیلے بھائیوں کے ناروا سلوک سے تنگ آ کر یہاں سے بھی کوچ کر گئے۔ دلّی جب تباہ و برباد ہو گئی تو انھوں نے بھی دیگر شعرا کی طرح دلّی سے لکھنو ہجرت کی اور یہاں آ کر نواب آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

میرؔ اردو غزل کے نمائندہ شاعر ہیں، انھیں اردو غزل کا امام و پیشوا بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے ہم عصر شعرا نے کیا بلکہ متاخرین نے بھی انہیں بہت سراہا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ان کو ''سرتاجِ شعرائے اردو'' قرار دیتے ہیں۔ میرؔ نے غزلیں بھی لکھیں اور مثنویاں بھی مگر جو مقام انھیں اردو غزل گوئی کی وجہ سے ملا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

میرؔ کی ذاتی زندگی رنج والم سے عبارت تھی۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں کے حملے اور دلی کی تباہی بھی انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ یوں ان کے ذاتی غم کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کا غم بھی مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے کلام میں ان کے ذاتی دکھوں کے ساتھ زمانے کا آشوب بھی دکھائی دیتا ہے۔ غم پسندی، دردمندی، سوز و گداز، دنیا کی بے ثباتی، ہستی کی ناپائیداری جیسے موضوعات ان کے کلام میں جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم تغزل، موسیقیت وغنائیت، مترنم بحریں، فارسی تراکیب، نادر تشبیہات واستعارات، فصاحت وبلاغت، تکرار الفاظ اور داخلیت ان کی غزلوں کا وصفِ خاص ہے۔

میرؔ کی تصانیف میں ایک خودنوشت ''ذکرِ میر'' ایک تذکرہ ''نکات الشعراء'' ایک فارسی اور چھے اردو دواوین شامل ہیں۔

(۱)

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اس رند کی بھی رات گزر گئی جو عُور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

ق

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پہ جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چُور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کُبھو کُسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(۲)

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے

ق

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میرؔ بلاکش ادھر آوے

مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

(i) میر تقی میر کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(ii) میر تقی میر کے والد کا کیا نام تھا؟

(iii) غزل کسے کہتے ہیں؟

(iv) میر کی پہلی غزل کی ردیف کیا ہے؟

(v) نکات الشعرا کا موضوع کیا ہے؟

۲۔ میر تقی میر کے حالاتِ زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ میر تقی میر کی شاعری کی خصوصیات پر نوٹ لکھیے۔

۴۔ (الف) اعراب لگا کر تلفظ کی وضاحت کیجیے:

مستعار، ظہور، چشم، منعم، خضر

(ب) ان تراکیب کی وضاحت کیجیے:

قاقم و سنجاب، کاسۂ سر، راہ بے خبر

۵۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور

☆

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) میر تقی میر کا تعلق کس شہر سے تھا؟

(الف) دہلی (ب) لکھنو

(ج) اکبرآباد (د) کلکتہ

(ii) میر کی وجہ شہرت کیا ہے؟

(الف) غزل (ب) مرثیہ

(ج) مثنوی (د) قصیدہ

(iii) مولوی عبدالحق نے ''سرتاجِ شعرائے اردو'' کس کو کہا ہے؟

(الف) خواجہ میر درد کو (ب) غالب کو

(ج) میر کو (د) اقبال کو

(iv) میر کی شاعری کا اہم ترین موضوع کیا ہے؟

(الف) مزاح (ب) غم و الم

(ج) تصوف (د) محاکات نگاری

۸۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
منعم کے پاس	محبت	
صناع ہیں سب خوار	حور	
دشتِ	تب چشم بھرآوے	
رشکِ	قاقم وسنجاب تھا	
جب نام ترا لیجیے	ازاں جملہ ہوں میں بھی	

غلام ہمدانی مصحفی

ولادت: ۱۷۵۰ء وفات: ۱۸۲۵ء

شیخ غلام ہمدانی نام اور مصحفی تخلص تھا۔ مصحفی ۱۷۵۰ء میں امروہہ میں شیخ ولی محمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ مصحفی نہایت پُرگو اور زود طبع شاعر تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ سلطنت اودھ کے صدر مقام فیض آباد میں بھی گزارا۔ ۱۷۷۶ء میں وہ دلّی روانہ ہو گئے جہاں انھوں نے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ دلّی تاراج ہو جانے کے بعد وہ بھی دیگر شعرا کی طرح لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں آ کر انھوں نے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ انھی دنوں انشاء اللہ خاں انشا بھی لکھنؤ آ گئے تو مرزا سلیمان شکوہ نے مصحفی کی تنخواہ کم کر دی اور انشا سے اصلاح لینے لگے۔ مصحفی اس صورت حال سے بہت دل شکستہ ہوئے۔ اسی دور میں ان کے اور انشاء کے معرکے بھی ہوتے رہے اور دونوں جانب سے ہجو و استہزا کا سلسلہ چلتا رہا۔ مصحفی عمر بھر لکھنؤ ہی میں مقیم رہے اور یہیں پر ۱۸۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مصحفی کا شمار اردو کے باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ میر خلیق، میر ضمیر اور آتش جیسے نامور اور باکمال شاعر بھی مصحفی ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مصحفی کے ذاتی حالات آسودہ و خوشحال نہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ محرومیوں اور پریشانیوں ہی میں گزارا تھا۔ پھر دلّی کی سماجی و معاشرتی، معاشی اور سیاسی زبوں حالی نے بھی انھیں حد درجہ متاثر کیا تھا۔

مصحفی کے کلام میں درد و غم، سوز و گداز، محرومی و ناآسودگی کے ساتھ ساتھ غنائیت، لطافت، نرم و شیریں آہنگ، جمال پسندی، دھیما پن اور لہجے کی گرمی کا احساس بھی ملتا ہے۔

اردو میں مصحفی کے آٹھ دیوان ہیں جن میں غزلیات کے علاوہ قصائد، قطعات اور مثنویاں بھی شامل ہیں۔

(۱)

نہ یاں کی شادی و غم کا بھروسا
نہ عشرت کا، نہ ماتم کا بھروسا

چمن ہے بے وفا تو باغباں! کر
نہ گل کا اور نہ شبنم کا بھروسا

ثباتِ زندگی ہے گرچہ دم پر
ولے ہم کو نہیں دم کا بھروسا

رہا تا آخرِ وقتِ رہائی
ہمیں اس زلفِ پُرخم کا بھروسا

بھریں کیوں کر جراحت بے کسوں کی
نہ پٹی اور نہ مرہم کا بھروسا

جراحتِ دل کا کیوں ہوتا نمک زار
جو پڑتا مجھ کو مرہم کا بھروسا

یہ عالم مصحفی جب ٹھہرے حادث
کریں پھر خاکِ عالم کا بھروسا

(۲)

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا؟

بجلی چمکی تھی، پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا؟

شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا؟

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا؟

مصحفیؔ! شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا؟ کیا تھا؟

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

(i) مصحفی کا اصل نام کیا تھا؟

(ii) غزل کے علاوہ مصحفی نے کس صنف میں طبع آزمائی کی؟

(iii) مصحفی کا تعلق کس شہر سے تھا؟

(iv) مصحفی سے اصلاح لینے والے کسی ایک مشہور شاعر کا نام بتایئے؟

۲۔ مصحفی کے حالات زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ مصحفی کے کلام کی خصوصیات لکھیے۔

۴۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف)۔ بجلی چمکی تھی، پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا؟

(ب)۔ ثباتِ زندگی ہے گرچہ دم پر
ویسے ہم کو نہیں دم کا بھروسا

۵۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) مصحفی کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) دہلی (ب) کلکتہ (ج) فیض آباد (د) امروہہ

(ii) مصحفی کے غزل کے کتنے دیوان ہیں؟

(الف) چھ (ب) سات (ج) آٹھ (د) نو

۶۔ حسب ذیل تراکیب کی تشریح کیجیے:

شادی و غم، ثباتِ زندگی، زلفِ پُرخم، روزِ ہجر

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
شادی و	زندگی	
ثباتِ	ہجر	
زلفِ	غم	
روزِ	پُرخم	
خواب	وصال	
ہجر	خیال	

خواجہ حیدر علی آتش

ولادت:۱۷۶۴ء وفات:۱۸۴۶ء

نام خواجہ حیدر علی اور آتش تخلص تھا۔ آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد بغداد سے ہجرت کر کے شاہجہان آباد آ گئے تھے۔ ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش تھا جو نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد آ گئے تھے۔ ان کے والد بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے چنانچہ آتش باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر پائے اور نہ مناسب تربیت ہی پا سکے۔ بعدازاں انھوں نے اپنے طور پر عربی اور فارسی کا مطالعہ کیا۔ آتش کا خاندان بزرگوں کا خاندان تھا جہاں پیری مریدی کا سلسلہ بھی موجود تھا۔ اسی بنا پر ان کی طبیعت میں فقر اور درویشی، قناعت و استغنا کے اوصاف پیدا ہو گئے۔ آتش گو کہ صوفی منش تھے مگر ان کی طبیعت میں سپاہیانہ رنگ بھی تھا۔ ان نے عمر بھر ہجو گوئی سے گریز کیا۔ وہ نہایت قانع اور صابر و شاکر انسان تھے۔ ان کا کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش نہ تھا مگر انہوں نے اپنے کسی مفاد کے لیے کبھی کسی بادشاہ یا نواب کی مدح و ستائش نہ کی۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی نواب اودھ کی طرف سے ملنے والے معمولی سے وظیفے پر ہی گزار دی۔

آتش عہد جوانی ہی میں لکھنؤ چلے گئے تھے اور مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ آتش کی شاعری کا تعلق دبستان لکھنؤ ہی سے ہے بلکہ ناسخ کی طرح آتش بھی لکھنؤ دبستان کے بانیوں میں سے ہیں۔ نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم جیسے مشہور شاعر بھی آتش کے تلامذہ میں سے تھے۔ آتش کا ۱۸۴۶ء میں لکھنو ہی میں انتقال ہوا۔

آتش غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کی بیشتر خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے کے دیگر شعرا کی طرح شاعری کو شاعرانہ صناعی، مرصع کاری اور الفاظ کی نگینہ کاری کہتے تھے۔ تاہم آتش کے ہاں عامیانہ و سوقیانہ پن دکھائی نہیں دیتا جو اس وقت کے لکھنوی شعرا کے کلام میں جا بجا نظر آتا ہے۔ آتش کے کلام میں فقر و غنا، توکل، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، قناعت پسندی، درویشانہ رنگ اور اخلاقی مضامین بکثرت دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزل، رجائیت، سادگی و سلاست، نادر تشبیہات و استعارات، عمدہ صنائع بدائع، رندانہ موضوعات اور آتش بیانی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

آتش کی تصانیف میں ان کا دیوان ہی اہم ہے جس میں ان کا وہ سارا کلام شامل ہے جو مختلف اصناف سخن کی صورت میں موجود ہے۔

(۱)

جگر کو داغ میں مانندِ لالہ کیا کرتا
لبالب اپنے لہو کا پیالہ کیا کرتا

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

جریدہ میں رہِ پُر خونِ عشق سے گزرا
جرس سے قافلہ میں بحث نالہ کیا کرتا

نہ کرتی عقل اگر ہفت آسماں کی سیر
کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

مہِ دو ہفتہ بھی ہوتا تو لطف تھا آتش
اکیلے پی کے شرابِ دو سالہ کیا کرتا

(۲)

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلایے نہ ہاتھ نہ دامن پساریے

طالب کو ایسے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریے

تنہائی ہے ، غریبی ہے ، صحرا ہے ، خار ہے
کون آشنائے حال ہے کس کو پکاریے

تبدیل روزِ وصل سے فرقت کی شب ہوئی
آئی ہوئی بلا ٹلی صدقہ اتاریے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے چلیے سدھاریے

نازک دلوں کو شرط ہے آتشؔ خیالِ یار
شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریے

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے :

(i) آتش کا پورا نام کیا تھا؟

(ii) آتش باقاعدہ تعلیم و تربیت کیوں حاصل نہ کر سکے۔

(iii) آتش کے والد کا کیا نام تھا؟

(iv) آتش کے تلامذہ میں سے کسی ایک کا نام بتائیے۔

۲۔ آتش کے حالات زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ آتش کے کلام کی خصوصیات لکھیے۔

۴۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

(ب) جریدہ میں رہِ پُر خونِ عشق سے گزرا
جرس سے قافلہ میں بحث نالہ کیا کرتا

۵۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) آتش کہاں پیدا ہوئے؟

(الف) بغداد (ب) دہلی

(ج) لاہور (د) فیض آباد

(ii) آتش کے آباواجداد کہاں سے ہجرت کر کے شاہجہان آباد آئے تھے؟

(الف) فیض آباد سے (ب) کلکتہ سے

(ج) کشمیر سے (د) بغداد سے

(iii) آتش نے شاعری میں کس کی شاگردی اختیار کی تھی؟

(الف) ولی دکنی کی (ب) خواجہ میر درد کی

(ج) مصحفی کی (د) غالب کی

(iv) آتش نے کب وفات پائی؟

(الف) ۱۷۶۴ء میں (ب) ۱۸۶۷ء میں

(ج) ۱۸۴۶ء میں (د) ۱۸۵۷ء میں

(v) آتش کی شاعری کا تعلق کس دبستان شاعری سے تھا؟

(الف) دبستان دلی سے (ب) دبستان لکھنو سے

۶۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
مانندِ	آسماں	
ہفت	یار	
دلِ	لالہ	
خیال	شکستہ	

۷۔ مندرجہ ذیل الفاظ وتراکیب کی وضاحت کیجیے:

رہِ خونِ عشق ۔ جریدہ ۔ مہِ دوہفتہ ۔ ہفت آسماں ۔ دلِ شکستہ

بہادر شاہ ظفر

ولادت: ۱۷۷۵ء وفات: ۱۸۶۲ء

نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر اور تخلص بھی ظفر ہی تھا۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے وہ آخری بادشاہ تھے جو تریسٹھ برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے تھے۔ انھیں شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا جس کی بنا پر انھوں نے شاہ نصیر، ذوق اور غالب سے بھی اصلاحِ سخن لی۔ بادشاہ ہونے کے باوجود ان کا اختیار صرف لال قلعے تک ہی محدود تھا۔ اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھ ہی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو رنگون جلا وطن کر دیا تھا جہاں انہیں طرح طرح کے آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں درد و غم، قنوطیت اور یاسیت ان کی زندگی کا جز ولاینفک بن گئی تھی۔ بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں دیارِ غیر ہی میں ظفر کا انتقال ہو گیا۔

ظفر کا کلام درد و غم کا مجموعہ ہے۔ ان کے ہاں رنج و الم، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، فقر و غنا اور بے بسی و لاچاری کے موضوعات عام ملتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے زمانے کا آشوب، ناکام حسرتوں کا نوحہ، سلاست و روانی، اثر آفرینی، داخلیت، مشکل قوافی، موسیقیت، شستہ زبان، لطافت، شیرینی، دل کشی اور سوز و گداز کا عمدہ مرقع ہے۔ ظفر نے اپنے خیالات کو مشکل زمینوں میں پیش کر کے اپنی قادر الکلامی کا اظہار کیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کا کلیات خاصا ضخیم ہے جو چار دواوین پر مشتمل ہے۔ کلیات ظفر میں اردو زبان کے علاوہ پنجابی اور پوربی زبان کے اثرات کے حامل اشعار بھی ملتے ہیں۔

(۱)

کسی کو ہم نے یاں اپنا نہ پایا
جسے پایا اسے بیگانہ پایا

کہاں ڈھونڈا اسے کس جا نہ پایا
کوئی پر ڈھونڈنے والا نہ پایا

اڑا کر آشیاں صَرصَر نے میرا
کیا صاف اس قدر تنکا نہ پایا

صبا نے جس دم سیکھا ہے کس سے
چمن میں ہلتے اک پتا نہ پایا

ظفؔر دل جانے یا ہم، کون جانے
کہ پایا اس میں کیا اور کیا نہ پایا

(۲)

جدھر آنکھ پڑتی ہے تو روبرو ہے
ترا جلوہ سب میں ہے سب جائے تو ہے

رکھوں آئنہ کیوں نہ پیشِ نظر میں
مری آرسی میرا آئینہ رو ہے

مری چشم میں کیا ہے؟ تیرا تصوّر
مرے دل میں کیا ہے؟ تری آرزو ہے

صدا پردۂ ساز کی یہ نہیں ہے
کوئی پردے میں کرتا گفتگو ہے

ظفؔر آپ کو ڈھونڈ، مت ڈھونڈ اس کو
وہ تجھ میں ہے، جس کی تجھے جستجو ہے

سوالات

ا۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) بہادر شاہ ظفر کا پورا نام کیا ہے؟
(ii) بہادر شاہ ظفر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
(iii) مغلیہ خاندان کا آخری بادشاہ کون تھا؟
(iv) بہادر شاہ ظفر کو رنگون میں کب جلاوطن کیا گیا؟
(v) بہادر شاہ ظفر کن ہم عصر شعرا سے اصلاح لیتے رہے؟

۲۔ بہادہ شاہ ظفر کے مختصر حالات زندگی بیان کیجیے۔

۳۔ بہادر شاہ ظفر کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۴۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) اڑا کر آشیاں صَر صَر نے میرا
کیا صاف اس قدر تنکا نہ پایا

(ب) رکھوں آئنہ کیوں نہ پیشِ نظر میں
مری آرسی میرا آئینہ رو ہے

۵۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے کون سے بادشاہ تھے؟
(الف) پہلے (ب) دوسرے (ج) تیسرے (د) آخری

(ii) بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے وقت عمر کیا تھی؟
(الف) باسٹھ برس (ب) تریسٹھ برس (ج) چونسٹھ برس (د) ستر برس

(iii) بہادر شاہ ظفر نے کہاں وفات پائی؟
(الف) دلّی (ب) رنگون (ج) لکھنؤ (د) آگرہ

(iv) بہادر شاہ ظفر کی وجہ شہرت کون سی صنف سخن ہے؟
(الف) قصیدہ (ب) مرثیہ (ج) غزل (د) مزاحیہ شاعری

٦۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
جسے پایا اسے	تیرا تصور	
جدھر آنکھ پڑتی ہے	کون جانے	
مری چشم میں کیا ہے	تری آرزو	
مرے دل میں کیا ہے	بیگانہ پایا	
ظفر دل جانے یا ہم	تو روبرو ہے	

محمد ابراہیم ذوق

ولادت:۱۷۸۹ء　　　　وفات:۱۸۵۴ء

نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوق تخلص تھا۔ ذوق ۱۷۸۹ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک نہایت غریب مگر باوقار گھرانے سے تھا۔ ان کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو ایک سپاہی تھے۔ ذوق نے ابتدائی تعلیم و تربیت حافظ غلام رسول سے پائی۔ حافظ غلام رسول شعر گوئی اور سخن فہمی کا قدرتی ملکہ رکھتے تھے۔ ذوق کو بھی شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا چنانچہ انھوں نے شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کر لی۔ شاہ نصیر اپنے زمانے کے باکمال شاعر تھے مگر جلد ہی یہ سلسلہ تلمذ ختم ہو گیا اور ذاتی مشقِ سخن سے ذوق نے اپنی شاعری میں مزید نکھار اور پختگی پیدا کر لی۔ ذوق کی شاعری کی دھوم جب مچی تو بہادر شاہ ظفر نے ذوق کے کمال فن کو دیکھتے ہوئے ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ یوں بہادر شاہ ظفر ان سے اصلاحِ شعر و سخن لینے لگے۔ بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو جاگیر اور سو روپیہ ماہوار مشاہرہ دینا شروع کر دیا۔ اردو شاعری میں ذوقؔ ہی وہ واحد مثال ہیں جو ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنے بلند و بالا مقام تک پہنچے کہ نہ صرف بادشاہِ وقت کے استاد مقرر ہوئے بلکہ خاقانی ہند کے خطاب سے بھی نوازے گئے۔ انھوں نے ۱۸۵۴ء میں دلّی ہی میں وفات پائی۔

ذوق ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے کلیات میں قطعات، رباعیات اور قصائد بھی موجود ہیں مگر غزل اور قصیدہ گوئی میں ذوق کا ایک منفرد اور جداگانہ انداز ہے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں بڑی صناعی، فنی چابک دستی اور حسن کاری سے کام لیا ہے۔ ان کی غزلیات بھی زبان و بیان کے حوالے سے ایک منفرد انداز کی حامل ہیں۔ انھوں نے جہاں اپنی غزلیات میں ٹکسالی اور مستند زبان استعمال کی ہے وہاں ان کی کئی غزلیات میں زبان کی شیرینی، لوچ اور محاورات و امثال کا بہترین استعمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ ذوق کی غزلیات سادہ زمینوں کے ساتھ ساتھ سنگلاخ زمینوں میں بھی دکھائی ہیں۔

ذوق کی غزل میں مضامین کا تنوع ملتا ہے۔ دنیا کی ناپائیداری، بے ثباتی، حسن و عشق کے جذبات و احساسات اور بالخصوص اخلاقی موضوعات ذوق کی غزل کا جزو خاص ہیں۔ شاعرانہ مہارت، بلند خیالی، زورِ بیان، موسیقیت و ترنم، محاورات و امثال کا برمحل استعمال اور عمدہ الفاظ و تراکیب ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۱)

مرے طالع میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جانا ہے کافی آتشِ غم کے شرارے کا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اس کے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا، ابد ہے اس کنارے کا

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

نفس ہے جادۂ عمرِ رواں جس طرح سے گزرے
یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستہ گزارے گا

فقط تارِ نفس کا ذوقؔ خط جادہ کافی ہے
پئے عمرِ رواں کیا چاہیے رستہ گزارے کا

(۲)

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جسِ انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

کیا تھا یا نہ تھا سب ہم پہ گزرا
فلک تو نے کیا اپنا پایا نہ پایا

سراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے
کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) ذوق کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ii) کون سے مشہور شاعر ذوق سے اصلاح لیتے تھے؟

(iii) خاقانی ہند سے کون سا شاعر مراد ہے؟

(iv) ذوق کا اصل نام کیا تھا؟

(v) ذوق کے ایک مشہور ہم عصر شاعر کا نام لکھیے۔

۲۔ ذوق کے حالات زندگی مختصراً لکھیے۔

۳۔ ذوق کی شاعری کی نمایاں خصوصیات مختصراً لکھیے۔

۴۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) مرے طالع میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جانا ہے کافی آتشِ غم کے شرارے کا

(ب) رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

۵۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) ذوق کا تعلق کس شہر سے تھا؟

(الف) دلی (ب) آگرہ
(ج) بمبئی (د) فیض آباد

(ii) ذوق کے والد پیشہ کے اعتبار سے کیا تھے؟

(الف) زمیندار (ب) تاجر

(ج) سپاہی (د) مزدور

(iii) ذوق نے شاعری میں کس سے اصلاح کی؟

(الف) بہادر شاہ ظفر (ب) شاہ نصیر

(ج) غالب (د) مومن

(iv) ذوق نے غزل کے علاوہ کس صنف میں نام پیدا کیا؟

(الف) ہجوگوئی (ب) مرثیہ

(ج) قصیدہ (د) مزاحیہ شاعری

(v) ذوق نے کب وفات پائی؟

(الف) ۱۸۵۴ء (ب) ۱۸۵۵ء

(ج) ۱۸۵۶ء (د) ۱۸۵۷ء

٦۔ درج ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کیجیے:

آتش غم، عمر رواں، مثال نیش کژدم، جادۂ عمرِ رواں، گردابِ بلا

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) میں دیے گئے الفاظ میں مطابقت پیدا کر کے کالم (ج) میں درج کیجیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
مرے طالع میں	شرارے	
آتشِ غم کے	ہاتھ کیا آئے	
نہ پکڑوں	ہے کیا کام	
سراغ عمرِ رفتہ	مثالِ نیش کژدم	
رہا ٹیڑھا	دامن الیاس	

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ولادت: ۱۷۹۷ء وفات: ۱۸۶۹ء

نام مرزا اسد اللہ بیگ اور غالب تخلص تھا۔ غالب اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے جو سمرقند سے ہجرت کر کے برصغیر پاک و ہند میں آباد ہو گئے۔ غالب ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد ایک جنگ میں گولی لگنے سے وفات پا گئے۔ پھر غالب کی پرورش کی ذمہ داری ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ پر آن پڑی۔ چار سال بعد چچا بھی وفات پا گئے اور یوں غالب کی کفالت کی ذمہ داری ان کے نانا نے لے لی۔

غالب جب تیرہ برس کے ہوئے تو ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے کر دی گئی۔ غالب اپنے کثیر اخراجات کی بناء پر ہمیشہ تنگدست اور مقروض رہے۔ ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہ تھا بلکہ چچا کی جو پنشن انھیں ملا کرتی تھی وہ بھی بوجوہ بند ہو گئی۔ البتہ غالب آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد بھی مقرر ہوئے تھے اور یوں ان کی معاشی حالت کچھ حد تک بہتر ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد کے بدترین حالات کو غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ غالب کی ذاتی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ دلّی کی تاراجی، سیاسی و معاشرتی زبوں حالی نے غالب کو بہت متاثر کیا بالخصوص غالب کی زندگی کا آخری حصہ بہت ہی زیادہ دکھوں اور تکلیفوں میں گزرا۔ ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا دلّی ہی میں انتقال ہوا۔

غالب ہر دور کے اہم شاعر ہیں۔ ان کی فنی عظمت کو ہر اک نے سراہا ہے۔ غالب اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ غالب کی ہمہ گیر شخصیت کی طرح ان کی شاعری میں بڑا تنوع اور بوقلمونی پائی جاتی ہے۔ غالب کے ہاں موضوعات کا اک لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے۔ اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں انفرادیت، جدت ادا، پہلوداری، معنی آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات، نئے نئے الفاظ و تراکیب، طنز و ظرافت اور آفاقیت وغیرہ شامل ہیں۔

(۱)

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
تجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جُنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(۲)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور، کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چُھٹ جائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں، کھائیں گے کیا

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) غالب کا پورا نام کیا تھا؟

(ii) غالب کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(iii) غالب کے آباواجداد کا تعلق کہاں سے تھا؟

(iv) غالب کس مغل بادشاہ کے استاد تھے؟

(v) غالب کی بیوی کا کیا نام تھا؟

۲۔ غالب کے مختصر حالات زندگی تحریر کیجیے۔

۳۔ غالب کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ حسب ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

اندوہ وفا ممنون معاصی فرشِ راہ دیدہ ودل
قحطِ غمِ الفت منت کشِ گلبانگِ تسلی

۵۔ ان اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

(ب) ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) غالب کی تاریخ وفات کیا تھی؟

(الف) ۱۸۵۷ء (ب) ۱۸۶۸ء

(ج) ۱۸۶۹ء (د) ۱۸۷۹ء

(ii) غالب کے والد کا نام کیا تھا؟

(الف) مرزا عبداللہ بیگ (ب) مرزا نصراللہ بیگ

(ج) نواب الٰہی بخش (د) اسداللہ بیگ

(iii) غالب کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(الف) آگرہ (ب) دلّی

(ج) لکھنؤ (د) کلکتہ

(iv) غالب کی وجہ شہرت کون سی صنفِ سخن ہے؟

(الف) قصیدہ (ب) قطعہ

(ج) رباعی (د) غزل

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
مر گیا	حالِ دل	
بے نیازی	ہم کو قید	
دیدہ و دل	وجہِ تسلی نہ ہوا	
گر کیا ناصح نے	فرشِ راہ	
نقشِ وفا	حد سے گزری	
ہم کہیں گے	صدمۂ یک جنبشِ لب سے	

مومن خاں مومن

ولادت:۱۸۰۰ء　　　　　　　　　　　　وفات:۱۸۵۱ء

نام مومن خاں اور تخلص بھی مومن ہی تھا۔ مومن دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا جو اپنے وقت کے نامور حکیم تھے۔ انھیں مغلیہ عہد میں شاہی طبیبوں میں شامل کرلیا گیا تھا اور بادشاہ سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔ مومن کے والد کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے خاص ارادت تھی۔ چنانچہ مومن کا نام بھی شاہ صاحب نے ہی تجویز کیا تھا۔ مومن نے ابتدا میں عربی کی تعلیم شاہ عبدالقادر سے حاصل کی۔ پھر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مروجہ علوم بھی سیکھے۔ علم نجوم، ریاضی، طب، موسیقی اور رمل میں مومن کو خاص مہارت حاصل تھی۔ تاریخ گوئی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ مومن خود بھی طبیب تھے۔ طبابت اور بزرگوں کی پنشن سے انھیں جو کچھ ملتا اس سے مومن کا گزر بسر باآسانی ہو جاتا تھا۔

مومن کو شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں وہ شاہ نصیر سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اپنی شاعری کو ذریعۂ معاش نہ بنایا اور نہ ہی کبھی امراء کی مدح سرائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اہل اقتدار کے قصیدے نہیں ملتے۔ مومن نے اپنی ساری زندگی تقریباً دِلّی ہی میں گزاری اور صرف پانچ مرتبہ ہی دِلّی سے باہر گئے مگر وطن کی محبت پھر واپس کھینچ لائی۔ وہ ۱۸۵۱ء میں اپنے گھر کی چھت سے گر کر پانچ ماہ تک علیل رہنے کے بعد دلی ہی میں انتقال کر گئے۔ ان کی تصانیف میں ایک دیوان اور چھ مثنویات ہیں۔ ان کے کلیات میں دیگر اصناف بھی موجود ہیں مگر بنیادی طور پر وہ ایک غزل گو شاعر تھے۔ غزل کی صنف میں ان کو خاص کمال حاصل تھا۔ ان کی غزل تغزل سے بھرپور ہے۔ وہ چونکہ عاشقانہ مزاج رکھتے تھے اس لیے ان کا کلام بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور ان کی غزلیں صرف عشق و عاشقی اور معاملہ بندی تک ہی محدود ہیں۔

مومن کی غزل تاثیر اور دلچسپی سے بھرپور ہے۔ تغزل ،معنی آفرینی ،معاملہ بندی، محاکات، جدّت بیان ،فطری پن، ندرتِ تراکیب، ایہام، سادگی وروانی، فارسی الفاظ وتراکیب، صنعت تضاد اور رمز وایماء وغیرہ مومن کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۱)

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں ہے
کہوں کچھ اور نکلے کچھ زباں سے

قیامت مرتے دم آئی فغاں سے
جہاں لے کر چلے ہیں ہم جہاں سے

مرا بچنا برا ہے آپ نے کیوں
عیادت کی لب معجز بیاں سے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

(۲)

چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلوٗ ہمیں
اضطراب دل غرض جینے نہ دے گا توٗ ہمیں

لطف سے ہوتی ہے کیا کیا بے قراری بن جفا
تیری بدخوئی نے ظالم کر دیا بدخو ہمیں

ہوش کیوں جاتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا
تجھ سے اے بادِ صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

باعثِ بیتابیِ عالم نگاہِ یاس ہے
چشمِ جادوگر نے یہ سکھلا دیا جادو ہمیں

گر یہی شوقِ شہادت ہے تو مومنؔ جی چکے
مار ڈالے کاش کوئی کافرِ دلجو ہمیں

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

(i) مومن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(ii) مومن کا تعلق کس شہر سے تھا؟

(iii) مومن کے والد کا پیشہ کیا تھا؟

(iv) مومن نے کس ہم عصر شاعر سے اصلاح لی؟

(v) مومن کو شاعری کے علاوہ کن علوم میں مہارت حاصل تھی؟

۲۔ مومن کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے:

۳۔ مومن کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے:

۴۔ حسب ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

بہرِ عدو، لبِ معجز بیاں، اضطرابِ دل، نگاہِ یاس، باعثِ بے تابیِ عالم

۵۔ حسب ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

☆☆☆

(ب) ہوش کیوں جاتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا
تجھ سے اے بادِ صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) مومن پیشہ کے اعتبار سے کیا تھے؟

(الف) جراح (ب) طبیب
(ج) تاجر (د) اتالیق

(ii) مومن کی مثنویوں کی تعداد کتنی ہے؟

(الف) چار (ب) پانچ
(ج) چھ (د) سات

(iii) مومن کی غزلیات کے کتنے دیوان ہیں؟

(الف) ایک (ب) دو
(ج) تین (د) چار

(iv) مومن کی وجہ شہرت کون سی صنف سخن ہے؟

(الف) قصیدہ (ب) مرثیہ

(ج) گیت (د) غزل

(v) مومن کی وفات کیسے ہوئی؟

(الف) گولی لگنے سے (ب) زخمی ہونے سے

(ج) بیمار رہنے سے (د) چھت سے گرنے سے

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
نہ ربط اس سے	کچھ زباں سے	
یہ حالت ہے تو	بے قراری	
کہوں کچھ اور نکلے	نگاہِ یاس ہے	
لطف سے ہوتی ہے کیا کیا	کیا حاصل بیاں سے	
باعث بیتابیِ عالم	نہ یاری آسماں سے	

علامہ محمد اقبالؒ

ولادت: ۱۸۷۷ء وفات: ۱۹۳۸ء

نام محمد اقبال اور تخلص بھی اقبال ہی تھا۔ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام نور محمد تھا۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم کا آغاز قدیم طرز پر ایک دینی مکتب میں ہوا۔ میٹرک کا امتحان نمایاں حیثیت میں پاس کرنے کے بعد وہ مرے کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے جہاں انھوں نے مولوی میر حسن جیسے فاضل استاد سے فیض حاصل کیا۔ ایف۔ اے کرنے کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھیں سر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ جیسے شفیق استاد سے رہنمائی حاصل کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ یہیں سے علامہ اقبال نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد اقبال کچھ عرصہ کے لیے اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ پھر ۱۹۰۵ء میں علم کی لذت انھیں یورپ لے گئی۔ قیام یورپ کے دوران میں انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی انگلستان سے بارایٹ لا کی ڈگری حاصل کی اور جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لی۔ ۱۹۰۸ء میں وہ وطن لوٹ آئے اور اپنی شاعری کے ذریعے سے ملک و قوم کی اصلاح کا کام لینے لگے۔

۱۹۲۲ء میں اقبال کو سرکار برطانیہ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ عظیم شاعر اور فلسفی دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اقبال قومی شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قومی رہنما اور عظیم مفکر بھی تھے۔ انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں پرسوز اور دلگداز شاعری کی۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا مگر جلد ہی ان کی طبیعت نظم گوئی کی طرف مائل ہو گئی۔ انھوں نے متعدد نظمیں لکھ کر قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس میں جہان تازہ کی جستجو کا جذبہ بھی ابھارا۔ اقبال نے اردو نظم کو فن اور موضوع کے اعتبار سے جو وسعت عطا کی وہ انھی کا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنی فکر اور مشاہدہ سے اردو شاعری کو لازوال عظمت و رفعت سے ہم کنار کیا۔ اقبال بلاشبہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

سوز و گداز، ترنم و تغزل، غنائیت و موسیقیت، اثر آفرینی، معنی آفرینی، عمدہ تشبیہات و استعارات، مقصدیت، تمثال نگاری وغیرہ اقبال کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

اقبال کی شعری تصانیف میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، پیام مشرق اور ارمغان حجاز وغیرہ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

(۱)

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلّت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

(۲)

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عِناں سمجھا تھا میں

کہ گئیں رازِ محبت پردہ داری ہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(i) علامہ اقبال کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ (ii) علامہ اقبال نے اپنا مشہور خطبہ کس شہر میں دیا تھا؟

(iii) علامہ اقبال نے کس کس زبان میں شاعری کی؟ (iv) علامہ اقبال کس سیاسی جماعت کے صدر منتخب ہوئے تھے؟

(v) زمانۂ طالب علمی میں اقبال کون کون سے اساتذہ سے متاثر ہوئے تھے؟

۲۔ علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ علامہ اقبال کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کیجیے: متاعِ بے بہا، کارِ آشیاں بندی، آدابِ فرزندی، ردائے نیلگوں، آوازِ رحیلِ کارواں

۵۔ درج ذیل اشعار کا مطلب بیان کیجیے۔

(الف) تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک — جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(ب) متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی — مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) علامہ اقبال نے کس کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے؟

(الف) گورنمنٹ کالج (ب) مرے کالج (ج) ایف۔سی کالج (د) ایم۔اے۔او کالج

(ii) علامہ اقبال کا سالِ پیدائش کیا ہے؟

(الف) ۱۸۷۶ء (ب) ۱۸۷۷ء (ج) ۱۸۷۸ء (د) ۱۸۷۹ء

(iii) علامہ اقبال کا سالِ وفات کیا ہے؟

(الف) ۱۹۳۷ء (ب) ۱۹۳۸ء (ج) ۱۹۳۹ء (د) ۱۹۴۰ء

(iv) اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز کس صنفِ سخن سے کیا؟

(الف) نظم گوئی (ب) غزل (ج) قصیدہ (د) مثنوی

(v) درج ذیل میں سے کون سا شعری مجموعہ اقبال کا ہے؟

(الف) پیامِ مشرق (ب) شعلۂ طور (ج) شبِ رفتہ (د) پہلی بارش

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے	مکتب کی کرامت تھی	
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ	اپنا جہاں سمجھا تھا میں	
آب و گِل کے کھیل کو	آسماں سمجھا میں	
اک ردائے نیلگوں کو	صدائے دردناک	
تھی کسی درماندہ رہرو کی	کارِ آشیاں بندی	
	ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں	

حسرت موہانی

ولادت:۱۸۷۸ء وفات:1951ء

نام سیّد فضل الحسن اور تخلص حسرتؔ تھا۔ حسرت ۱۸۷۸ء میں اودھ کے مشہور قصبے موہان میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے موہانی کہلائے۔ ان کے والد کا نام سیّد از ہر حسن تھا۔ حسرتؔ نے ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں پائی۔ قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم اپنے قصبے کے علما سے حاصل کی۔ مڈل کی تعلیم مڈل سکول سے جب کہ انگریزی کی تعلیم فتح پور کے گورنمنٹ ہائی سکول سے حاصل کی۔ پھر یہیں پر عربی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد حسرتؔ، علی گڑھ چلے گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے حسرتؔ نے بی۔اے کیا اور یہاں انھیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور سجاد حیدر یلدرم جیسے نامور لوگوں کا ساتھ ملا۔

بی۔اے کرنے کے بعد حسرت کا رجحان صحافت اور سیاست کی طرف مبذول ہو گیا اور حسرتؔ نے ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا۔ ''اردوئے معلیٰ'' اپنے عہد کا قابل قدر سیاسی و ادبی پرچہ تھا جس میں سیاسی، ادبی اور مذہبی مضامین شایع ہوتے تھے۔ حسرتؔ کو تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی پاداش میں بارہا قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان سب تکالیف اور مسائل کے باوجود بھی حسرتؔ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔

حسرتؔ بیک وقت سیاسی رہنما، بے باک صحافی اور باکمال شاعر تھے۔ حسرتؔ کو ''رئیس المتغزلین'' بھی کہا جاتا ہے۔ اصلاحِ سخن کے سلسلے میں حسرتؔ نے منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ شاعری میں حسرتؔ کا مجموعۂ کلیات بہت مقبول ہے۔ حسن و عشق کی واردات، نشاطیہ رنگ، بے ساختگی، نکتہ آفرینی، معاملہ بندی، فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، روزمرہ، محاورہ اور قومی و سیاسی رنگ حسرتؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

حسرتؔ کی تصانیف یہ ہیں:

''کلیاتِ حسرتؔ''، ''شرحِ دیوانِ غالب''، ''نکاتِ سخن''، ''محاسنِ سخن''۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف شعرا کے اردو دیوانوں کا انتخاب بھی کیا۔

(۱)

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالبًا یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

(۲)

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبیعت بھی

دشوار ہے رندوں پر انکارِ کرم یکسر
اے ساقیِ جاں پرور! کچھ لطف و عنایت بھی

رکھتے ہیں مرے دل پر کیوں تہمتِ بے تابی
یاں نالۂ مضطر کی جب مجھ میں ہو قوّت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حُریتِ کامل کا
منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

ہیں شادؔ و صفیؔ شاعر، یا شوقؔ و وفاؔ حسرتؔ
پھر ضامنؔ، محشرؔ ہیں، اقبالؔ بھی، وحشتؔ بھی

سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھیے:

(i) حسرت موہانی کا اصل نام کیا ہے؟ (ii) حسرت موہانی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(iii) حسرت موہانی کس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے؟ (iv) حسرت موہانی نے کس تحریک میں حصہ لیا؟

(v) حسرت کن کن شعرا سے متاثر تھے؟

۲۔ حسرت موہانی کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ حسرت موہانی کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مفہوم واضح کیجیے:

آشنائے راز، شاملِ اربابِ امتیاز، مشقِ سخن، انکارِ کرم، فکرِ دو عالم

۵۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

(الف) ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

(ب) ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیے:

(i) حسرت موہانی کی وجہ شہرت کون سی صنفِ سخن ہے؟

(الف) نظم (ب) غزل (ج) مرثیہ (د) رباعی

(ii) غزل کے کس شاعر کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے؟

(الف) اصغر گونڈوی (ب) جگر مرادآبادی (ج) حسرت موہانی (د) ناصر کاظمی

(iii) حسرت نے شاعری کے علاوہ کس میدان میں نام پیدا کیا؟

(الف) تجارت (ب) وکالت (ج) صحافت (د) تعلیم وتدریس

(iv) حسرت موہانی کا سالِ وفات کیا؟

(الف) ۱۹۵۰ء (ب) ۱۹۵۱ء (ج) ۱۹۵۲ء (د) ۱۹۵۳ء

(v) حسرت موہانی کے جاری کردہ رسالے کا کیا نام تھا؟

(الف) اردو نامہ (ب) جام جہاں نما (ج) اردوئے معلّٰی (د) اردو زبان وادب

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
دلوں کو فکرِ دو عالم سے	چکی کی مشقت بھی	
جو چاہے آپ کا	امتیاز کرے	
ہے مشقِ سخن جاری	لطف وعنایت بھی	
شاملِ ارباب	حسن کرشمہ ساز کرے	
دشوار ہے	کر دیا آزاد	
	رندوں پر	

اصغر گونڈوی

وفات:۱۹۳۶ء　　　　　　　　　　　　　　　　ولادت:۱۸۸۴ء

نام اصغر حسین اور تخلص بھی اصغر تھا۔ اصغر یکم مارچ ۱۸۸۴ء کو گونڈہ (بھارت) میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے گونڈوی کہلائے۔ ان کے آباواجداد کا اصل وطن گورکھ پور ہے۔ اصغر کے والد قانون گو تھے۔

اصغر نے باقاعدہ طور پر علوم وفنون کی تحصیل نہ کی بلکہ کچھ دنوں تک ایک انگریزی مدرسہ میں پڑھ کر چھوڑ دیا۔ بعدازاں انٹرنس کے امتحان کی تیاری کی مگر خانگی پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ تاہم انھوں نے اپنے ذاتی مطالعہ اور فطری صلاحیت کی بنا پر اپنی علمی وادبی قابلیت میں اضافہ کرلیا۔

اصغر ابتدا میں تجارت کرتے تھے۔ دارالمصنفین کے رکن ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد سے بھی منسلک تھے۔ اصلاحِ شعروسخن کے ضمن میں ابتدا میں اپنا کلام منشی خلیل احمد بلگرامی کو دکھاتے رہے۔ پھر منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی اس سلسلہ میں اصلاح لیتے رہے مگر جلد ہی یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

اصغر گونڈوی کو قدرت نے ایک نکتہ رس اور بلاغت شناس دماغ سے نوازا تھا۔ وہ ایک ممتاز غزل گو تھے اور انھوں نے زیادہ تر غزلیں لکھی ہیں۔ خیالات کی پاکیزگی، تصوف وفلسفہ اور اندازِ بیان کی لطافت ان کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔ علاوہ ازیں تغزل وترنم، ندرتِ ادا، لطافتِ خیال، صفائی وبرجستگی، جوش ومستی، کیف وسرور، رنگینی وظرافت جیسی خوبیاں اصغر کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔

''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' اصغر کے شعری مجموعے ہیں۔

(۱)

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسّم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی
یہیں پہ ختم ہوجاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

مری اک بے خودی میں سیکڑوں ہوش و خرد گم ہیں
یہاں کے ذرّہ ذرّہ میں ہے وسعت اک بیاباں کی

نگاہ یاس و آہ عاشقان و نالۂ بلبل
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں ان کے پیکاں کی

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ ! کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی دیوار زنداں کی

(۲)

آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لیے ہوئے
جنت میں بھی ہوں جنتِ دنیا لیے ہوئے

پاسِ ادب میں جوشِ تمنّا لیے ہوئے
میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لیے ہوئے

کس طرح حسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار
صد ہا حجابِ صورت و معنٰی لیے ہوئے

تو برقِ حسن اور تجلّی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

اصغرؔ ہجومِ دردِ غریبی میں اس کی یاد
آئی ہے اک طلسمِ تمنّا لیے ہوئے

سوالات

۱۔ مختصر جوابات لکھیے:

(i) اصغر گونڈوی کا اصل نام کیا ہے؟

(ii) اصغر گونڈوی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(iii) اصغر گونڈوی کے آبا و اجداد کا اصل وطن کون سا تھا؟

(iv) اصغر گونڈوی کے والد کا پیشہ کیا تھا؟

(v) اصغر گونڈوی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

۲۔ اصغر گونڈوی کے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ اصغر گونڈوی کے کلام کی خصوصیات لکھیے۔

۴۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کیجیے۔

تبسم ہائے پنہاں، نگاہِ یاس، اسیرانِ بلا، ذوقِ تماشا، برقِ حسن

۵۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

☆

تو برقِ حسن اور تجلّی سے یہ گریز
میں خاک اور ذوقِ تماشا لیے ہوئے

۶۔ ان تراکیب کی وضاحت کیجیے:

ہوش و خرد، نگاہِ یاس، نالۂ بلبل، معاذاللہ، ہجومِ درد

۷۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) اصغر گونڈوی کا شعری مجموعہ کون سا ہے؟

(الف) شعلۂ طور (ب) بہارستان

(ج) برگ نے (د) نشاط روح

(ii) اصغر گونڈوی نے ابتدا میں کون سا پیشہ اختیار کیا تھا؟

(الف) تجارت (ب) صحافت

(ج) سیاست (د) تعلیم و تدریس

(iii) اصغر گونڈوی کس یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے؟

(الف) پنجاب یونیورسٹی میں (ب) الہ آباد یونیورسٹی میں

(ج) لکھنؤ یونیورسٹی میں (د) کسی میں بھی نہیں

(iv) اصغر گونڈوی کے آبا و اجداد کا اصل وطن کونسا تھا؟

(الف) گونڈہ (ب) گورکھپور

(ج) لکھنؤ (د) افغانستان

(v) اصغر گونڈوی کا سال وفات کیا ہے؟

(الف) ۱۹۳۶ء (ب) ۱۹۳۷ء

(ج) ۱۹۳۸ء (د) ۱۹۳۹ء

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
رخ رنگیں پہ موجیں ہیں	جنت دنیا لیے ہوئے	
شعاعیں کیا پڑیں	دریا لیے ہوئے	
جنت میں بھی ہوں	آہ کیا کہیے	
میں بھی ہوں اک حباب میں	تبسم ہائے پنہاں کی	
اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو	رنگت نکھر آئی گلستاں کی	
تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی	دیوار زنداں کی	

جگر مرادآبادی

ولادت: ۱۸۹۰ء　　　　وفات: ۱۹۶۰ء

نام علی سکندر اور جگر تخلص تھا۔ وہ ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے اور اسی مناسبت سے جگر مرادآبادی کہلائے۔

جگر کو شعر وسخن سے فطری لگاؤ تھا۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے غزل گوئی شروع کردی۔ انھوں نے اصلاحِ سخن کے لیے اصغر گونڈوی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ جگر کی غزلیات تغزل سے بھرپور ہیں اور اسی بنا پر انھیں بھی حسرت موہانی کی طرح رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔

جگر ایک غزل گو شاعر تھے اور غزل گوئی ہی ان کی مقبولیت کا باعث ہے۔ وہ اپنے دور کی ہر بزمِ سخن کی جان تھے۔ ان کا انداز اس قدر مسحور کن اور پُر تاثیر ہوتا تھا کہ جس محفل میں بھی جاتے وہاں چھا جاتے۔ ان کا مزاج عاشقانہ تھا اور اسی لیے ان کے کلام کا بیشتر حصہ عشق و عاشقی کے موضوعات پر مبنی ہے۔ جدید دور کے غزل گو شاعروں میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔

تغزل، ترنم، موسیقیت وغنائیت، رنگینی ورعنائی، سلاست و روانی جگر کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

جگر کے شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

شعلۂ طُور، جذباتِ جگر، تخیلاتِ جگر، نغماتِ جگر، دردِ جگر اور آتشِ گُل۔

(۱)

فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرح لے جا رہا ہے دل مجھے

اب زباں بھی دے، ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تُو نے بجائے دل مجھے

کیسا قطرہ؟ کیسا دریا؟ کس کا طوفاں؟ کس کی موج؟
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے

توڑ کر بیٹھا ہوں راہ شوق میں پائے طلب
دیکھنا ہے جذبۂ بیتابیٔ منزل مجھے

یہ بھی کیا منظر ہے، بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں قدم
تک رہا ہوں ، دور سے منزل کو میں، منزل مجھے

(۲)

سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
جس حال میں ہوں اب مجھے افسوس نہیں ہے

ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے
پوچھو تو کہیں بھی نہیں، دیکھو تو یہیں ہے

میری ہی طرح وہ بھی نہ ہو ہجر میں بے تاب
ہر سانس کے ساتھ آج اک آوازِ حزیں ہے

میں بے اثرِ جذب محبت سہی لیکن
کیا کم ہے، وہ میرے لیے بے تاب نہیں ہے

میں اور ترے ہجرِ جفاکار کے صدقے
اس بات پہ جیتا ہوں کہ مرنے کا یقیں ہے

سوالات

۱۔ مختصر جوابات لکھیے:

(i) جگر مرادآبادی کا اصل نام کیا ہے؟

(ii) جگر مرادآبادی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(iii) جگر مرادآبادی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

(iv) جگر مرادآبادی نے شاعری میں کس شاعر سے اصلاح لی؟

(v) جگر مرادآبادی کا اندازِ غزل گوئی کیسا تھا؟

۲۔ جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر کیجیے۔

۳۔ جگر مرادآبادی کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کیجیے:

ہوشِ جادۂ منزل، پائے طلب، آوازِ حزیں، ہجرِ جفاکار، جذبۂ بےتابیٔ منزل

۵۔ درج ذیل اشعار کا مطلب بیان کیجیے:

کیسا قطرہ؟ کیسا دریا؟ کس کا طوفاں؟ کس کی موج؟
تو جو چاہے تو ڈبو دے خشکیٔ ساحل مجھے

ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے
پوچھو تو کہیں بھی نہیں، دیکھو تو یہیں ہے

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایے:

(i) جگر کا تعلق کس جگہ سے تھا؟

(الف) الہٰ آباد (ب) مرادآباد

(ج) حیدرآباد (د) وزیرآباد

(ii) جگر کس سے اصلاحِ سخن لیتے تھے؟

(الف) حسرت موہانی (ب) اصغر گونڈوی

(ج) علامہ اقبال (د) فانی بدایونی

(iii) شعلۂ طور کس شاعر کا مجموعہ ہے؟

(الف) اصغر گونڈوی (ب) شادؔ عظیم آبادی

(ج) ناصر کاظمی (د) جگر مرادآبادی

(iv) جگر مرادآبادی نے کس سال میں وفات پائی؟

(الف) ۱۷۶۰ء (ب) ۱۹۶۱ء

(ج) ۱۹۶۲ء (د) ۱۹۶۴ء

(v) جگر کی شاعری کا نمایاں موضوع کیا ہے؟

(الف) عشق وعاشقی (ب) فلسفہ

(ج) تصوف (د) مزاح

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
فکرِ منزل ہے نہ	راہِ شوق میں پائے طلب	
تو جو چاہے تو ڈبودے	ہجرِ جفا کار کے صدقے	
توڑ کر بیٹھا ہوں	ہجر میں بے تاب	
میں اور ترے	بڑھتے ہیں نہ ہٹتے ہیں قدم	
میری طرح وہ بھی نہ ہو	خشکیٔ ساحل مجھے	
یہ بھی کیا منظر ہے	ہوشِ جادۂ منزل مجھے	

ناصر کاظمی

ولادت: ۱۹۲۵ء وفات: ۱۹۷۲ء

نام سیّد ناصر رضا اور تخلص ناصؔر تھا۔ ان کا شجرۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے جاملتا ہے۔ اسی تعلق سے یہ کاظمی کہلوائے۔ ناصر کاظمی ۸۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں انبالہ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد سلطان کاظمی انڈین رائل آرمی میں صوبے دار میجر تھے۔ ناصر کاظمی نے مسلم ہائی سکول انبالہ، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور (تقسیم کے بعد کچھ عرصہ) جیسے نامور اداروں میں تعلیم پائی۔

ناصر کاظمی قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور یہاں مختلف ملازمتوں پر فائز رہے۔ ناصر کاظمی محکمہ امدادِ باہمی کے رسالے ''ہم لوگ'' کے نائب مدیر اور ادبی رسالے ''ہمایوں'' کے مدیر کے طور پر ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ناصر کاظمی آخری ایام میں کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ رہے۔ ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو معدے کے سرطان کی وجہ سے وفات پا گئے۔

ناصر کاظمی اردو غزل کے اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے اس وقت غزل گوئی کو فروغ بخشا جب ملک بھر میں نظم گوئی اپنے عروج پر تھی۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے روح فرسا حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر سقوطِ ڈھاکہ کے افسوس ناک سانحے نے بھی اُن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیات میں اداسی، تنہائی، یادِ رفتگاں، ہجرت کا دکھ، احساسِ محرومی و ناکامی جیسے موضوعات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔

تمثالیت، موسیقیت، مترنم بحریں، عمدہ تشبیہات و استعارات، جدتِ فکر وغیرہ ناصر کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ناصر کاظمی کے شعری مجموعے حسبِ ذیل ہیں:

''برگِ نے''، ''دیوان''، ''پہلی بارش''، ''نشاطِ خواب''، ''سُر کی چھایا'' (منظوم ڈراما)

(۱)

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصرؔ
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

(۲)

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہوگئے سونا ہوئے رخسار بھی

درد کے جھونکوں نے اب کی دل ہی ٹھنڈا کردیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں اچھا بھی ہوں بیمار بھی

سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیادار بھی

کس طرح گزرے گا ناصؔر فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایۂ دیوار بھی

سوالات

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(i) ناصر کاظمی کا پورا نام کیا تھا؟

(ii) ناصر کاظمی کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(iii) ناصر کاظمی کے والد کا کیا نام تھا؟

(iv) ناصر کاظمی کس ادبی رسالے کے مدیر تھے؟

(v) ناصر کاظمی کے شعری مجموعوں کے نام لکھیے۔

۲۔ ناصر کاظمی کے حالات زندگی مختصراً بیان کیجیے۔

۳۔ ناصر کاظمی کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

۴۔ حسبِ ذیل تراکیب کا مفہوم بیان کیجیے:

احساسِ زیاں ، نشۂ خوابِ گراں ، کنجِ اماں ، فرصتِ ہستی

۵۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

درد کے جھونکوں نے اب کے دل ہی ٹھنڈا کردیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

۶۔ درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگایئے:

(i) ناصر کاظمی کا سال پیدائش کیا ہے؟

(الف) ۱۹۲۴ء (ب) ۱۹۲۵ء

(ج) ۱۹۲۶ء (د) ۱۹۲۷ء

(ii) ناصر کاظمی کس کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔

(الف) ایف۔سی کالج (ب) اسلامیہ کالج

(ج) ایم۔اے۔او کالج (د) اورینٹل کالج

(iii) ناصر کاظمی نے کس بیماری کی وجہ سے وفات پائی تھی؟

(الف) دمے کی وجہ سے (ب) پھیپھڑوں کے سرطان کی وجہ سے

(ج) معدے کے سرطان کی وجہ سے (د) عارضۂ قلب کی وجہ سے

(iv) ناصر کاظمی بھارت کے کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(الف) کلکتہ (ب) انبالہ

(ج) بمبئی (د) آگرہ

(v) ناصر کاظمی کا سالِ وفات کیا ہے؟

(الف) ۱۹۷۲ء (ب) ۱۹۷۳ء

(ج) ۱۹۷۴ء (د) ۱۹۷۵ء

۷۔ کالم (الف) کا کالم (ب) سے ربط قائم کیجیے اور جواب کالم (ج) میں لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج)
سفرِ شوق کے	عمر کی رفتار بھی	
دل عجب	دیدۂ خونبار بھی	
رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا	مکاں تھا پہلے	
آگ برساتا تھا آگے	کنجِ اماں تھا پہلے	
وقتِ بے قید	فرسنگ نہ پوچھ	
	نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے	

کتاب کے مؤلفین اور مدیران کے مختصر کوائف

مؤلفین:

ڈاکٹر محمد خان اشرف

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو)، پی ایچ ڈی (اردو)
تدریسی تجربہ: ۲۲۔سال
علمی وادبی کام: ۱۹۔مطبوعہ کتابیں، تقریباً ۵۰ مطبوعہ مضامین۔

پروفیسر سمعیہ جلیل صدیقی

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سمن آباد، لاہور
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو)
تدریسی تجربہ: ۱۰۔سال
علمی وادبی کام: ۱۱۔مطبوعہ کتب۔
ادارت: نائب مدیر ''شاخسار'' لاہور۔

پروفیسر اشتیاق احمد

استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، قصور
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو)، ایم۔ایڈ
تدریسی تجربہ: ۱۴۔سال
علمی وادبی کام: ۶۔مرتبہ کتب۔

پروفیسر ایاز اصغر شاہین (مرحوم)

مدیران:

ڈاکٹر علی محمد خان

پروفیسر شعبہ اردو، ایف سی کالج لاہور
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو، تاریخ)، پی ایچ ڈی (اردو)
تدریسی تجربہ: ۴۳۔سال
علمی وادبی کام: ۲۷۔مطبوعہ کتابیں، متعدد مطبوعہ مضامین۔
ادارت: ''دبستان'' لاہور (۱۴ سال تک)

مس مہر النساء خانم

سابق پرنسپل، گورنمنٹ گرلز ہائر سیکنڈری سکول، اعوان ٹاؤن، لاہور
تعلیمی قابلیت: ایم۔اے (اردو)، ایم۔ایڈ
تدریسی تجربہ: ۱۸۔سال